ناياب جيلاني

# میں ہاری پیا

ایئرپورٹ کی پرشکوہ عمارت بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ گاڑی اب کھلی شفاف سڑک پر رواں دواں تھی۔ سفید نئے ماڈل کی کرولا کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ گاڑی پاپا کے دوست کی بیٹی سویرا نے اس کے آنے سے پہلے ہی خریدی تھی۔ ابھی آدھا گھنٹہ پہلے وہ سویرا کو بھاری بھرکم رقم کا چیک پکڑا کر آئی تھی۔

وہ شروع سے ہی آرام طلب تھی۔ لوکل بسوں اور ٹیکسیوں کے سفر سے اسے شروع سے ہی نفرت تھی بلکہ اسے تو اس جگہ سے بھی نفرت تھی جہاں اس

## مکمل ناول

وقت وہ خود اپنی مکمل دلی رضامندی کے ساتھ جا رہی تھی۔

"بھلا ایسے ۔۔ہو سکتا ہے کہ اشفا ہارون کا دل پلٹ جائے۔" بہت سال پہلے کی یہ بات تو نہیں کہ "حیات آباد" کے مکین اس کے حقارت میں کہے گئے ان الفاظ کو بھلا چکے ہوں بلکہ وہ تو یقیناً" اسے اپنے گھر دیکھ کر اور یہ جان کر کہ اشفا ہارون اب ہمیشہ کے لیے یورپ کے سحر سے آزاد ہو کر ان کے درمیان رہنے کے لیے آ گئی ہے اس کا بھرپور تمسخر اڑائیں گے۔ وہ ان تمام راستوں سے انجان ہونے کے باوجود ایک مرتبہ بھی راستہ نہیں بھولی تھی۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرتے ہوئے اس کی بے قرار نگاہیں سبز پینٹ کیے بورڈ سے ٹکرائیں تو دل اک پل کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔

"ڈیرہ مرتضیٰ حیدر۔" وہ کئی لمحے ان الفاظ کو زیر لب دہراتی رہی تھی۔ چھ سال پہلے وہ اس شخص سے شدید ترین نفرت کرتی تھی مگر اب چھ سال بعد بھی اسی ایک شخص کی محبت سے لبریز تھا۔

"اگر اسے مرتضیٰ حیدر سے ہی محبت ہونا تھی تو محبت چھ سال پہلے کیوں نا اس کے دل میں انگڑائی لے کر جاگی۔" یہ ایسا سوال تھا جو وہ پچھلے کئی مہینوں سے خود سے کر کر کے تھک چکی تھی۔

اسے یاد تھا پہلی مرتبہ اسی سڑک پر پسینے سے شرابور میلے کپڑوں میں ملبوس مرتضیٰ حیدر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت اشفا کے پاپا بھی اس کے ہمراہ تھے۔ پاپا نے ہی مرتضیٰ کو پہچان کر گاڑی رکوائی اور پھر بڑے تپاک سے مرتضیٰ کو گلے سے لگایا۔ مرتضیٰ نے ٹریکٹر کے انجن کو بند کیا اور پھر سفید پگڑی نما چادر جو کہ شاید دھوپ سے بچنے کے لیے سر اور چہرے کو ڈھانپنے کی غرض سے لی تھی سے اپنا بے حد سرخ سفید چہرہ صاف کیا۔

"آپ گھر چلیں چچا جان! میں ابھی آتا ہوں۔" مرتضیٰ نے بابا کو مخاطب کرتے ہوئے اک بھرپور نگاہ اس پر بھی ڈالی تھی۔ اشفا کا کوفت و جھنجلاہٹ سے رواں رواں سلگ اٹھا۔ اسے اپنا یہ کزن قطعاً" پسند نہیں آیا تھا بلکہ اسے تو حیات آباد میں بسنے والے مکینوں میں سے کوئی ایک بھی قابل توجہ نہیں لگا تھا اور اس وقت وہ ان سب سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ اس کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں۔ اک نرم گلابی ننھا وجود، جس کے نقش بھی اس نے غور

نہیں دیکھے تھے بار بار کھلکھلاتا ہوا نگاہوں کے سامنے آتا تو وہ بے چین ہو کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دیتی۔
"تم کتنی سنگدل ماں ہو۔" کوئی اس کے کان کے قریب چلایا تو اشفا نے بے ساختہ اپنے سرخ چمکیلے لبوں کو کچل ڈالا۔
"میرا بچہ، میری جان، میرا شازم۔" اس کے دل میں ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اس ممتا، محبت کو اس نے نفرتوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ ایک مرتبہ نمرہ نے کہا تھا کہ "اشفا تم بہت خود غرض ہو۔" اور اشفا نے تو بہت عرصہ پہلے ہی اپنی خود غرضی کو تسلیم کر لیا تھا۔

وہ بہت خود غرض تھی، مغرور تھی، خود پسند تھی۔ بے حد ضدی، ہٹ دھرم اور جذباتی تھی۔ ان تمام خوبیوں نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں پچھتاوے ڈسنے لگتے ہیں۔ اس کی سوچوں کو اس وقت بریک لگا جب گاؤں کی حدود اور کچے پکے مکانوں پر نگاہ پڑی۔ حیات محمد کا وہ بہت وسیع و عریض احاطے والا گھر قریب آیا جس کے اندرونی حصے میں بے شمار کمرے اور برآمدے تھے تو اس کا دل نئے سرے سے دھڑک اٹھا۔

یہ بہت بڑا گھر ڈھیروں محبتوں کو سموئے بانہیں پھیلا کے کھڑا تھا مگر چھ سال پہلے وہ اس گھر کو ٹھوکر مار کر اور ان محبتوں سے منہ موڑ کر خود چلی گئی تھی اور آج وہ پھر اسی دروازے پر کھڑی گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھی۔
لکڑی کا بڑا سا دروازہ بند تھا اور اشفا کے ہاتھ دستک کے لیے اٹھ نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، وہ یونہی چلچلاتی دھوپ میں ہر شے سے بے نیاز کھڑی رہی اور پھر تمام ہمتوں کو جمع کر کے اس نے دروازے کو دھکیلا تو وہ خود بخود ہی کھلتا چلا گیا۔
وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔ اندرونی دروازے کے قریب اس کے قدم ایک دفعہ پھر زنجیر پا ہو گئے۔
"کیا یہ لوگ مجھے قبول کریں گے۔ تمام تر نافرمانیوں، من مانیوں اور بدتمیزیوں کے باوجود مجھے ایک دفعہ پھر سینے سے لگا لیں گے، کیا اس گھر کی طرح ان کے ظرف بھی وسیع ہیں۔" یہ وہ سوال تھے جن کے جواب کم از کم اسے اس وقت بھی نہیں مل رہے تھے جب وہ امریکہ میں ان لوگوں کی یاد اور شازم سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔ ان چار مہینوں کے اندر اندر وہ یعنی اشفا ہارون سر تاپا بدل گئی تھی۔
اس کا دل کیا بدلا، سوچ اور نظریات تک بدل گئے۔ اتنے برسوں سے وہ جس ماحول کا حصہ رہی تھی ایک دم ہی وہ ماحول اجنبی اور پرایا پرایا لگنے لگا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے آشیانے کی طرف اڑ کر پہنچ جائے مگر بہت سی مجبوریوں کی وجہ سے اسے کچھ عرصہ اور وہاں رکنا پڑا تھا۔
پاپا کا اتنی محنت، جدوجہد اور انتھک کوششوں سے بنایا گیا وہ مختصر سا ہوٹل بیچ کر اور اپنے بے حد پیارے گھر کو فروخت کر کے وہ اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ اس گھر میں اس کی بے حد سید ھی اور معصوم سی ماما کی ڈھیروں یادیں تھیں۔ اس کا بچپن اور لڑکپن تھا مگر اب وہ محض یادوں کے سہارے جینا نہیں چاہتی تھی۔ حقیقی خوشیوں کو پانے کے لیے ہی تو وہ پلٹ آئی تھی، لوٹ آئی تھی مگر نہ جانے یہ مسرتیں اسے میسر آئی تھیں بھی کہ نہیں۔
سفر کی تھکان اب آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ دودھیا گداز مخروطی انگلیوں والے ہاتھوں سے آنکھیں دباتے ہوئے دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہ رہی تھی جب ایک دم ہی اندر سے کسی نے دروازہ کھول دیا تھا اور وہ کوئی اور نہیں مہوش تھی۔ جو کہ نہ جانے کتنے ہی رنگ آنکھوں میں لیے یک ٹک اشفا کو دیکھے جا رہی تھی۔
اشفا نے جھجک کر مہوش کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مہوش کے چہرے سے سرخی چھلکنے لگی تھی جبکہ آنکھوں میں نفرتوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا۔
حیرت، بے یقینی اور اس کے بعد بے تحاشا ناگواری و نفرت کے اس استقبال نے اشفا کی رہی سہی ہمت کو بھی نچوڑ دیا تھا۔



"کیا لینے آئی ہو یہاں۔" مہوش نے زہریلے لہجے میں کہا۔
"مم ۔۔۔ میں تم سب سے ملنے، میرا مطلب ہے کہ شازم سے۔" اشفا اس کے سخت الفاظ پر ہکلا کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کا ازلی اعتماد ایک دم اڑنچھو ہو گیا تھا۔ اس کی تمام تر بہادری اور بے خوفی اس وقت صرف ایک ہی "خوف" کے زیر اثر تھی کہ یہ لوگ مجھے دھتکار نہ دیں۔ ٹھکرا نہ دیں، کیونکہ اشفا ہارون اب کے تمام کشتیاں جلا کر آئی تھی۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنا غلیظ وجود لے کر۔ نفرت مجھے تم سے، اگر غیرت ہوتی تم میں تو کبھی لوٹ کر نہ آتیں مگر تم جیسی عیاش امیرزادیاں بے غیرتی میں اگری لیے پھرتی ہیں۔" مہوش نے غصیلی آواز میں چیخ کر کہا اور پھر غراتے ہوئے اشفا کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر کچھ قدم پیچھے ہٹ گئی تھی۔
"نکل جاؤ اس گھر سے، تمہاری اب یہاں جگہ نہیں ہے۔" مہوش دو سیڑھیاں مزید نیچے اتر آئی اور پھر اس کا گداز ملائم بازو اپنے شکنجے میں جکڑ کر ایک دفعہ پھر جھٹکا دے کر بولی۔
"اس گھر میں سب تم سے نفرت کرتے ہیں۔ مر چکی ہو تم سب کے لیے، مرتضیٰ تمہاری شکل پر تھوکے گا بھی نہیں۔ کس آس، کس امید پر آئی ہو۔ نکلتی ہو یا لگاؤں دو ہاتھ۔" مہوش تو بھری شیرنی کی طرح گویا اس پر جھپٹنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اتنی توہین، اس قدر بے عزتی۔ اشفا کے سفید گال تپ اٹھے، آنکھیں گلابی سے سرخی مائل ہو گئیں۔
"مم، مجھے شازم سے ملنے دو۔" اس نے لڑکھڑائی آواز میں کہا تو مہوش ایک مرتبہ پھر چنگھاڑی۔
"کون شازم، کوئی تعلق نہیں تمہارا شازم کے ساتھ، اب دفع ہو جا۔ ورنہ بالوں سے گھسیٹ کر باہر پھینک آؤں گی۔ جا چلی بھی جا۔" مہوش کو یہ بھی خوف تھا کہ اندر سے دادی یا تائی میں سے کوئی اٹھ کر نہ آ جائے۔ کسی کے بھی آنے سے پہلے وہ اس عذاب کو نکال دینا چاہتی تھی۔
"میں چلی جاتی ہوں، مگر مجھے میرے بچے سے ملنے دو۔ میں ایک مرتبہ اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔" آنکھوں سے بہتے آنسو، لبوں پر التجا مگر سامنے کھڑی عورت نہ دیکھ رہی تھی نہ سن رہی تھی۔ وہ بس جلد از جلد اسے گھر سے نکال دینا چاہتی تھی مگر کیوں؟
اشفا کے حواس ٹھکانے ہوتے یا پھر وہ پہلے والی حد درجہ حاضر جواب، منہ پھٹ اور بااعتماد اشفا ہوتی تو ایک مرتبہ ضرور مہوش سے یہ سوال کرتی کہ میرا اس گھر کے مکینوں سے کچھ اور بھی رشتہ ہے اور میں بھی اس گھر میں تمہاری طرح برابر کی حصے دار ہوں مگر اس کے لبوں پر تو قفل لگ چکے تھے۔ اس کی خاموش التجاؤں کا مہوش پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اشفا نے تھکی تھکی نگاہ اس کے پتھریلے تاثرات والے چہرے پر ڈالی اور پھر لرزیدہ قدموں سے پلٹنے لگی۔ اسی پل بیرونی دروازہ کھلا تایا ابا اپنی ہی دھن میں اندر آئے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔
سامنے آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اشفا کھڑی تھی۔
ان کی بھتیجی اشفا، ان کے پیارے بھائی کی اکلوتی بیٹی اور ان کی بہو بھی۔
ان کے لرزیدہ وجود میں حرکت ہوئی اور پھر انہوں نے آگے بڑھ کر اشفا کو سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی تایا ابا



UrduPhoto.com

کے مہربان سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔
"اشفا! تم نے آنے میں کیوں اتنی دیر کر دی؟" ان کے کانپتے ہاتھ اس کا سر تھپتھپا رہے تھے۔
"کیوں چلی گئی تھیں تم بغیر بتائے۔ تمہیں ہماری محبتیں بھی نہ روک سکیں' شازم کے وجود نے بھی تمہارے قدموں کو زنجیر نہ کیا اور مرتضیٰ..." تایا ابا کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھی۔ اس کا سر اور ماتھا چومتے ہوئے وہ بہت رنجیدہ تھے۔
"اور مرتضیٰ۔" اشفا نے کچھ خوفزدہ سے انداز میں ان کے سینے سے سر اٹھایا۔
"مرتضیٰ تمہارے منہ پر تھوکے گا بھی نہیں۔" مہوش سامنے کھڑی تمسخرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو کہ تایا ابا کے بازو کے حلقے میں لڑکھڑاتے ہوئے بمشکل اپنے وجود کو گھسیٹ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"لکی! ایک بیڈ نیوز سنو۔" وہ پھولی سانسوں سمیت تقریباً" بھاگتے ہوئے اس کے پیچھے آئی تھی۔ لکی جو کہ اپنے ہی دھیان میں مگن سیٹی پر کوئی دھن گنگناتے ہوئے موسم انجوائے کر رہا تھا ایک دم ہی ٹھٹک کر رکا۔
"بیڈ نیوز..." لکی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے ہونٹ سکیڑے اور پھر بولا۔
"بیڈ نیوز نہیں' گڈ نیوز بولو۔ آنٹی ڈیزی کی ڈیتھ میرے لیے ایک اچھی خبر ہے جسے میں بار بار سننا چاہوں گا۔" لکی نے لاپرواہی سے اپنی اکلوتی خالہ کے متعلق کمنٹس پاس کیے' جنہیں مرے ہوئے ابھی آٹھ گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔
"بہت کمینے ہو تم لکی۔" اشفا نے دانت پیسے۔
"وہ تو میں ہوں ہی' تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی خوبیوں کے بارے میں پتا ہے۔" وہ ہنوز لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا تو اشفا جھنجلا سی گئی۔
"میں تمہیں کچھ اور بتانا چاہتی ہوں۔"
"یہی نا کہ آنٹی ڈیزی کی تمام پراپرٹی اب میری ہے۔ وہ مرنے سے پہلے تمام جائیداد میرے نام کر گئی ہیں۔"
"نہیں..... آنٹی نے پراپرٹی تمہارے حوالے کر دی' امپاسبل۔" اشفا کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آنٹی اپنے اس بھانجے سے کتنی نفرت کرتی ہیں۔
"ہاں' بس آنٹی نے جاتے جاتے مجھے بھی حیران کر دیا ہے۔" لکی مسکرایا اور پھر مزید بولا۔
"کون سی بیڈ نیوز بتانا چاہ رہی ہو۔"
"او..... ہاں دراصل پاپا اور ماما پاکستان جا رہے ہیں۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔"
"کیا اچھی بات ہے' ماما مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ رہی ہیں۔" اشفا کو اب اس کے انداز پر غصہ آنے لگا تھا۔
"تم بھی چلی جاؤ ان کے ساتھ پاکستان' گھوم پھر آؤ۔ میں بھی کچھ عرصے تک ورلڈ ٹور پر نکل جاؤں گا۔ آخر نیا نیا امیر ہوا ہوں' سیر و تفریح میرا حق ہے۔" لکی نے اب کچھ حیرانی سے لکی کی طرف دیکھا تھا جس کے تیور واقعی بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ نئی نئی دولت کا خمار تھا۔
"میری خواہش تو تھی کہ تم بھی میرے ساتھ جاتیں مگر خیر' میں تمہارا پروگرام کیوں خراب کروں۔ تمہاری ماما تو ویسے بھی مجھے پسند نہیں کرتیں۔" اشفا جان گئی تھی کہ اب وہ صرف دامن بچانے کے لیے بہانے کر رہا ہے۔ جب اسے جاب کی ضرورت تھی تب وہ پاپا کے ہوٹل میں ڈش واشنگ کے لیے بھی تیار تھا۔ اور یہ اشفا ہی تھی جس نے پاپا کو بمشکل منا کر اسے قدرے بہتر جاب دلائی۔ اشفا کو ایک دم ہی اس سے گھن محسوس ہوئی تھی۔
"تھرڈ کلاس پاکستانی۔" اشفا نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ آنٹی ڈیزی کی مہربانی سے لکی کو گرین کارڈ تو مل ہی چکا تھا۔ اب وہ کسی نیشنیلٹی ہولڈر..... لڑکی کی تلاش میں تھا تاکہ تمام پیپرز کلیئر کروا سکے۔ اشفا اس لحاظ سے اسے کافی پسند آئی تھی کیونکہ نا صرف وہ بے حد حسین تھی بلکہ بہت دولت مند بھی تھی مگر مسئلہ اس کے ماں



باپ کا تھا جو کہ اس پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔
"ہائے اشفا' مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ پھر ملیں گے۔" سامنے سے آتی ٹیکسی کو روک کر وہ جھپاک سے اس میں بیٹھا اور یہ جا وہ جا۔
"اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔" اشفا نے تنفر سے کہا اور سر جھٹکتی اپنے گھر کی طرف آ گئی۔ داخلی دروازے پر ماما کوڑے کی باسکٹ لیے کھڑی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر لجاجت سے بولیں۔
"ٹینا آج آئی نہیں' اور میں سیڑھیاں اتر نہیں سکتی۔ یہ باسکٹ کا کوڑا ڈرم میں الٹ آؤ۔" اشفا نے بغیر بحث کیے باسکٹ پکڑ لی۔ ڈرم کے قریب آ کر اس نے ڈھکن اٹھایا اور گویا لکی کی نام نہاد دوستی کو بھی اسی ڈرم میں دفنا کر چلی آئی۔
اس نے لکی پر بہت احسانات کیے تھے۔ جب اس کی آنٹی نے لکی کو گھر سے نکال دیا تب وہ اس مجبور بے کس پاکستانی کو گھر لے آئی۔ پاپا کی منت سماجت کر کے جاب دلوائی۔ تین چار ماہ تک اس کے تمام اخراجات اس نے اپنے ذمے لے لیے۔ اسے لکی پر ترس آ گیا تھا جب وہ اسی کوڑے کے ڈرم کے پاس رکھے سرخ بینچ پر لیٹا بآواز بلند اپنی قسمت کو روتے ہوئے کوس رہا تھا۔
لکی نے اپنی مجبوریوں کی ایسی داستان سنائی کہ اشفا کا دل پسیج گیا۔ وہ لکی میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ وہ تو صرف اس سے ہمدردی کر رہی تھی مگر ماما نہ جانے کیا سمجھیں۔ انہوں نے لکی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ انہیں یہ خوف تھا کہ ان کی سر پھری بیٹی کہیں اس نکمے لڑکے سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کر لے۔ مگر جب اشفا کو ماما کے اس فعل کے متعلق پتا چلا تو محض ماما کی ضد میں اس نے لکی کے ساتھ رابطہ ختم نہیں کیا تھا۔ نہ جانے کیوں اسے ماما کی روک ٹوک سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ جس کام سے اسے منع کرتیں' دانستہ یا نادانستہ اشفا سے وہ ہی غلطی سرزد ہو جاتی تھی۔
اس کی ماما بے حد بھولی بھالی سیدھی سی گھریلو خاتون تھیں مگر تھیں تو اس کی ماں۔ ہر وقت اس پر نظر ہوتی تھی ان کی' اشفا کہاں جا رہی ہے۔ کہاں سے آ رہی



UrduPhoto.com

ہے۔ یونی ورسٹی میں کون کون سے فرینڈز ہیں۔ انہیں مکمل خبر ہوتی۔

یونیورسٹی میں اشفا کا کوئی دوست نہیں یہ خبر ان کے لیے باعث اطمینان تھی۔ اشفا کا مزاج ایسا تھا کہ کوئی خود سے اس کے قریب نہیں پھٹک سکتا تھا۔ مگر نہ جانے کب اس لکی منحوس پر اس کی نظر پڑی تھی اور وہ اس پر ترس کھا کر اسے گھر لے آئی۔ ماما نے جب اسے گھر سے نکالا تو وہ لکی کی وجہ سے ماما سے لڑ پڑی۔ ان کے سمجھانے بجھانے کا الٹا اثر ہوا اور اس نے لکی کو ہوٹل میں جاب دلوادی۔ اپنی گاڑی بھی اسے استعمال کے لیے دے دیتی تھی۔

وہ کوڑے کی خالی باسکٹ دروازے کے پاس رکھ کر اندر جانے کی بجائے جلتی بھنتی اپنی دوست مرینہ کے گھر چلی آئی۔

"بہت دنوں بعد شکل دکھائی ہے۔" مرینہ نے دروازہ کھول کر مسکراتے ہوئے کہا جواباً" وہ مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

"کافی غصے میں لگ رہی ہو؟" اشفا کو ہونٹ چباتے اور سرخ چہرہ لیے دیکھ کر مرینہ نے کہا تو وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں مرینہ! کہ یہ سب پاکستانی لالچی اور خود غرض ہوتے ہیں۔"

"ہوا کیا ہے؟" مرینہ پریشانی سے بولی۔

"وہ لکی کمینہ اوقات دکھا گیا ہے۔" اشفا اسی غصے کے عالم میں پھنکاری۔ "میں تو اس کے بدلے تیور دیکھ کر شاک میں تھی۔ اتنا خیال ہی نہیں آیا کہ اپنی وہ رقم جو میں نے بطور قرض اسے دی تھی وہی مانگ لیتی۔ وہ رقم معمولی نہیں تھی کہ میں اسے بخش دیتی۔"

"تو اب مانگ لو۔" مرینہ نے نرمی سے کہا۔

"وہ تو دفعان ہو گیا ہے۔" اشفا نے دانت پیسے۔

"کہاں....." مرینہ بھی چونک اٹھی تھی۔

"نہ جانے کہاں، مجھے ایک بات کا تو پکا یقین ہے کہ آنٹی ڈیزی نے اپنی پراپرٹی دلی خوشی سے ہرگز لکی کو نہیں دی ہوگی۔ اس چالباز نے یقیناً" بڑی چالاکی سے آنٹی سے پیپرز پر سائن کروائے ہوں گے۔"

"اس بات کا امکان ہے۔" مرینہ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔

"بہت ہی کمینہ اور ذلیل نکلا ہے احسان فراموش بالکل یاسر کی طرح۔" اشفا کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ مرینہ کے چہرے پر اک سایہ سا لہرایا۔

"تم نے بھی تو اس خبیث پر احسان کیا تھا اسے امریکہ بلوایا، شادی کی اور پھر وہ بھی اپنی اوقات دکھا گیا۔" مرینہ کا چہرہ زردی مائل ہو گیا تھا۔ اسے بہت سال پہلے کے کچھ منظر یاد آنے لگے تھے۔ جب وہ اپنی ماں کے ہمراہ لاہور اپنی پھوپھو کے پاس گئی تھی۔

وہ خوب صورت نہیں تھی۔ اس بات کا اسے خود بھی علم تھا۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی مگر پھوپھو اور ان کی فیملی نے تو ایسے اس کا استقبال کیا گویا وہ کسی ریاست کی شہزادی ہے۔ ان کی بیٹیاں اس کی تعریفیں کر کر کے نہیں تھکتی تھیں اور خود یاسر اس نے تو گویا مبالغہ آمیزی کی حد کر دی تھی اور نہ جانے کیوں مرینہ سب کچھ جانتے بوجھتے اس کی باتوں کے سحر میں جکڑی گئی۔ اس حقیقت کا تو اسے بہت بعد میں اور اک ہوا تھا کہ یہ شادی صرف اور صرف یاسر نے اپنا مستقبل بنانے کی خاطر کی تھی۔ جب اس نے اپنے قدم جما لیے تو بہت سے اپنے ہی ہم مزاج مادہ پرست اور سطحی ذہنیت کے پاکستانیوں کی طرح وہ بھی مرینہ کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسانے دوسرے شہر چلا گیا تھا۔

"سوری مرینہ! میں نے تمہیں دکھی کر دیا۔" اپنی جھونک میں بولتی اشفا کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ بہت غلط بول رہی ہے۔

"کوئی بات نہیں۔" مرینہ رنجیدگی سے مسکرائی۔

"جی تو چاہ رہا ہے کہ اس لکی کمینے کو شوٹ کر دوں۔" ایک مرتبہ پھر اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

"یوں کرو، پولیس کو انفارم کر دو۔"

"مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا مگر....." اشفا نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔

"مگر کیا....."

"پاپا سے ڈر لگتا ہے۔" وہ جتنی بھی غصیلی، نک چڑھی اور ضدی تھی مگر ماں باپ کے سامنے اس کی



بولتی بند ہو جاتی تھی۔ خصوصاً" پاپا سے اسے بہت خوف آتا تھا۔

"ایک بات پوچھوں اشفا! غصہ تو نہیں کرو گی۔" مرینہ نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو، بولو کیا پوچھنا ہے۔"

"کیا تم لکی میں انٹرسٹڈ ہو۔"

"اوف..... تم نے یہ سوچا بھی کیسے۔ میں تو صرف اس سے ہمدردی کر رہی تھی مگر ماما سمیت نہ جانے سب کیا سمجھے۔" اشفا نے اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ مرینہ کو پشیمانی ہوئی۔

"آئم سوری....."

"اٹس اوکے....." وہ ہولے سے مسکرائی اور پھر دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر کی طرف چل دی۔

☆ ☆ ☆

رات بھر مسلسل برف باری ہوتی رہی تھی۔ اس موسم کے نیویارک میں بسنے والے پاکستانی امریکن شہری اب عادی ہو چلے تھے۔

اشفا کسلمندی سے کمبل ہٹا کر اٹھی اور پھر گلاس ونڈو سے بھاری کرٹن ہٹا کر نیچے رواں دواں زندگی کا جائزہ لینے لگی۔ اسی پل اس کی نگاہ آنٹی ڈیزی کے مکان کی طرف اٹھی تھی۔ گیٹ کے پاس پولیس کھڑی تھی۔ اشفا کو حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر اس کے ذہن میں سے کچھ روشن ہوا۔ وہ پولیس کو مایوس پلٹتا دیکھ کر تاسف سے سر ہلانے لگی تھی۔

"گھاگ شکاری بھاگ گیا ہے۔"

"مگر پولیس کے شکنجے سے تم بھی نہیں بچو گے۔ اسے اپنے ملک کی پولیس مت سمجھنا۔" وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر باہر آئی تو ماما اور پاپا اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی جلدی اٹھنے کا نئے سرے سے عہد کر کے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"کیا لو گی اشفا۔" ماما نے کافی کا مگ پاپا کی طرف بڑھاتے ہوئے جمائیاں لیتی اشفا سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے سستی سے کہا۔

"کیا مطلب، یہ بوائل ایگ اور دودھ کا گلاس پیو۔" ماما نے کرسٹل کی ٹرے میں مختصر ناشتا اس کے سامنے رکھا۔

"جب کرنی ہمیشہ اپنی مرضی ہوتی ہے تو پھر پوچھتی کیوں ہیں؟" اشفا نے بے دلی سے دودھ کا گلاس اٹھا لیا۔ ماما اب پاپا سے باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔ اشفا کو جواب دینا انہوں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"سیٹیں کب کنفرم ہوں گی۔" ماما کے لہجے میں بے تابی تھی۔ اشفا چونک اٹھی۔

"تیاری تو مکمل ہے، بس ایک دو ضروری کام نبٹالوں ان شاء اللہ پندرہ بیس دن بعد ہم پاکستان میں ہوں گے۔"

"میں نے بھی کچھ شاپنگ تو کر لی ہے اور باقی اشفا کو ساتھ لے جاؤں گی اور عروبہ، مہوش کے لیے یہ اپنی پسند سے شاپنگ کر لے گی۔ نمرہ اور ثانیہ نے تو اپنی اپنی پسند بتا دی ہے مجھے۔ نجمہ کی بچیوں کے لیے بھی کپڑے خرید لیے ہیں۔" ماما بڑے جوش کے عالم میں پاپا کو تفصیلات فراہم کر رہی تھیں۔ پاپا بھی بہت دلچسپی سے سن رہے تھے۔ اشفا کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"اپنے گھر، اپنے وطن کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

"اونہہ....." اشفا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اٹھی اور صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی آن کر لیا۔

"آپ نے بھائی جان سے بات کی۔" ماما کا لب و لہجہ حد سے زیادہ دھیما ہو چکا تھا۔ اشفا نے لاپرواہی سے ٹی وی پر نگاہیں جما دیں۔



UrduPhoto.com

"ہوں۔" پاپا نے آہستگی سے ہنکارا بھرا اور بولے۔
"وہ سب تو ہمارے آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ بھابھی نے تو ابھی سے تیاریاں بھی شروع کردی ہیں۔ بس جاتے ہی چھوٹی سی رسم کے بعد نکاح کردیں گے۔" انہوں نے تمام تفصیلات سے بیوی کو آگاہ کیا تو وہ ایک دم ہی مطمئن اور سرشار ہو گئیں۔ اکلوتی بیٹی کے مستقبل کے حوالے سے وہ بے حد پریشان تھیں۔
پاپا کے جانے کے بعد وہ کچن سمیٹ کر اشفا کے پاس آبیٹھی تھیں۔ اشفا نے چونک کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"تم بھی آہستہ آہستہ اپنی پیکنگ مکمل کرلو۔"
"کیوں؟"
"ہم عنقریب پاکستان جانے والے ہیں۔" عطیہ بیگم نے نرمی سے جواب دیا۔
"صرف آپ اور پاپا میں نہیں جاؤں گی۔"
"تم یہاں اکیلی رہو گی۔ تمہارے پاپا ہرگز نہیں مانیں گے۔" انہوں نے اپنے ازلی نرم لہجے میں کہا تو وہ تنک اٹھی۔
"آخر پہلے بھی تو پاپا پاکستان اکیلے جاتے رہے ہیں۔"

"مجھے سولہ سال ہو گئے ہیں اپنے گھر اور اپنے لوگوں سے ملے ہوئے۔ تمہاری وجہ سے ہمیشہ میں اپنے دل کو مار لیتی تھی۔ پہلے اسکول' کالج پھر یونیورسٹی' تمہاری پڑھائی کا حرج نہ ہو جائے یہی سوچ مجھے روک دیتی مگر اب کوئی رکاوٹ نہیں اور تمہیں بھی دادی سے ملے اتنے ہی سال ہو گئے ہیں۔ تم سے ملنے کے لیے بہت بے تاب ہیں۔ خوامخواہ بدمزگی نہ پھیلاؤ ہونا وہی ہے جو تمہارے پاپا چاہتے ہیں۔ اچھی بیٹیوں کی طرح اپنی تیاری مکمل کرو اور فرمانبرداری سے والدین کی بات مانتی جاؤ۔ ماں باپ بچوں کے لیے کبھی بھی غلط فیصلہ نہیں کرتے۔" وہ چند لفظوں میں نہ جانے کون کون سے مفہوم واضح کر کے اٹھ گئی تھیں جبکہ اشفا غصے سے تنتناتی رہ گئی۔

اتوار کے روز وہ ماما کی بنائی لسٹ کے مطابق شاپنگ کر کے آئی تو ماما کو فون پر مصروف پایا۔ یقیناً" پاکستان سے فون آیا تھا اور اب کم از کم ڈیڑھ دو گھنٹے مسلسل باتیں ہونا تھیں۔ ماما عادتاً" تمام خاندان کی خیریت تفصیلاً" دریافت کرتی تھیں اور جتنے تفصیل کے ساتھ ماما کے سوال ہوتے تھے اسی حساب سے مکمل معلومات دینے والے بھی بھرپور فرصت سے چیدہ چیدہ واقعات ماما کے گوش گزار کرتے۔
جوں ہی ان کی نگاہ اشفا پر پڑی تو انہوں نے دوسری طرف شخصیت کو ہولڈ کرنے کا کہہ کر اسے آواز دے کر بلایا۔ مرتا کیا نہ کرتا وہ مرے مرے قدم اٹھاتی ماما کے برابر رکھے صوفے پر ڈھے گئی تھی۔
"دادی سے بات کرلو۔" انہوں نے زبردستی اس کے کان سے ریسیور لگایا۔ دوسری طرف دادی کی محبت سے لبریز آواز سماعتوں سے ٹکرائی تو اس نے اک طویل سانس خارج کر کے ان کے متوقع سوالوں کے لیے خود کو تیار کرلیا۔
"میری بچی کیسی ہے؟"
"ٹھیک ہوں۔" وہ لب و لہجے کی بے زاری چھپا نہیں پائی تھی۔
"میں تو ہر گھڑی تم لوگوں کی آمد کا انتظار کر رہی ہوں۔ برسوں بیت گئے تمہاری اور عطیہ کی صورت دیکھے ہوئے۔ ہارون تو تقریباً" ہر سال ہی آتا ہے مگر تم ـــ" ہر دفعہ فون پر ان سے اسی قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ اشفا کی بے زاری دوچند ہو گئی۔
"میں نے تمہارے لیے بہت شاندار کپڑے بنوائے ہیں۔ ایک ایک جوڑا بہت قیمتی اور نفیس ہے اور زیورات بھی بہت خوب صورت ہیں۔" اشفا غائب دماغی سے جی جی کر رہی تھی۔ ماما نے غصے سے بھناتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ریسیور پکڑ لیا۔ اشفا جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتی اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔
اسی شام ہسپتال سے فون آیا کہ مرینہ کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اشفا پریشانی کے عالم میں ماما کو



مختصراً بتا کر ہسپتال چلی آئی۔
اگرچہ مرینہ کو چوٹیں اتنی شدید نہیں آئی تھیں مگر وہ ذہنی طور پر بے حد نڈھال تھی۔ تنہائی کے احساس نے اس بتیس سالہ عورت کو اندر سے توڑ دیا تھا۔ اشفا کی مسلسل دل جوئی اور تیمارداری نے اگرچہ اسے کافی سنبھالا دیا تھا مگر پھر بھی اک کمی تھی جو کہ دل و روح کو مسلسل چاٹ رہی تھی۔
اشفا نے ایک دن مرینہ سے چوری ڈائری میں سے یاسر کا نمبر لے کر اسے فون کر ڈالا۔ فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ یہ نمبر اس کی فیکٹری کا تھا جہاں وہ ملازمت کرتا تھا۔ اشفا نے مرینہ کا ایکسیڈنٹ اور اس کی ذہنی حالت کے متعلق اتنے دلسوز انداز میں بتایا تھا مگر پھر بھی اس سنگدل انسان پر قطعاً" اثر نہ ہوا۔ پہلے پہل وہ نرمی سے بات کرتی رہی تھی مگر یاسر کی بدزبانی جب بڑھی تو اس کا بھی پارہ چڑھ گیا۔
"وہ تمہاری بیوی ہے اور اسے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔"
"وہ میری بیوی اب نہیں ہے۔ شاید اس نے تمہیں نہیں بتایا میں اسے طلاق دے چکا ہوں۔"
دوسری طرف یاسر نے قدرے تحمل سے کہا تو اشفا چلا اٹھی۔
"جھوٹ مت بولو' اپنی ذمے داریوں سے جان چھڑوانے کے لیے بہانے مت بناؤ بے غیرت انسان۔"
"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرا اس کے ساتھ اب کوئی تعلق نہیں۔" یاسر نے بھی ناگواری سے کہا۔
"وہ تمہاری کزن تو ہے۔ اس رشتے سے تو انکار نہیں کرو گے۔"
"اونہہ کزن۔" یاسر تنفر سے بولا۔
"بہت کمینے انسان ہو تم۔ پہلے اسی رشتے کا سہارا لے کر تم نے فراڈ کے ساتھ مرینہ سے شادی کی۔ گرین کارڈ اور امریکہ کی روشنیوں نے تمہیں اندھا کردیا ہے۔ میری دعا ہے کہ تمہاری بینائی کبھی واپس نہ آئے اور تم اسی طرح اندھیروں میں رہو۔" اشفا نے دو چار موٹی گالیاں دے کر فون رکھ دیا تھا۔
اس کے دل میں وہ نفرت جو کہ بہت آہستہ آہستہ پنپ رہی تھی ایک دم جڑیں پکڑ کر تناور درخت بن گئی۔ اس کے سامنے تصویر کے جو رخ آئے تھے وہ بہت بھیانک تھے اس نے ان منفی پہلوؤں کو اپنے دل اور ذہن پر نہ مٹانے کے لیے نقش کرلیا تھا۔
مرینہ کی صحت اب قدرے بہتر تھی مگر اشفا روزانہ ہی اس کے فلیٹ میں آجاتی۔ اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی۔ تقریباً" بیس پچیس دن بعد مرینہ بھی کام پر جانے لگی تھی۔ ابھی وہ مرینہ کی طرف سے پوری طرح مطمئن نہیں ہو پائی تھی کہ اچانک ماما کی طبیعت بگڑ گئی۔
ماما کی بیماری کے دوران اسے احساس ہوا تھا کہ ماما نے اسے اور پاپا کو کس طرح سنبھال رکھا تھا۔ ان کی غیر موجودگی میں پورے گھر کا نظام الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ کوئی بھی چیز اپنے ٹھکانے پر نہیں تھی۔
ماما کی صحت بحال ہوئی تو انہوں نے پاکستان جانے کی رٹ لگا دی۔ پاپا' ماما کی صحت کی وجہ سے جلدی جلدی کام سمیٹ رہے تھے۔ اشفا نے ماما کی ضد کی وجہ سے ایک دم ہی جاب کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے چپکے چپکے اپنے تئیں کوششیں جاری رکھیں۔ ایک ماہ کے اندر اندر اسے ایک اچھی کمپنی سے جاب کی آفر ہوئی تو اس نے جوائن کرنے میں اک پل کی بھی دیر نہ کی۔ ماما کو اگرچہ بہت اعتراض تھا مگر پاپا نے نہ جانے کیا کہہ کر انہیں مطمئن کردیا کہ پھر دوبارہ انہوں نے اس کی جاب کے متعلق کوئی بات نہ کی۔
اشفا کی روٹین کافی ٹف تھی۔ صبح صبح آنکھ کھلنے میں اتنی دیر لگ جاتی اور پھر تیاری بھی نامکمل سی ہوتی' وہ اتنی آرام طلب تھی اور اب کہاں اسے اتنی محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف اور صرف پاکستان جانے سے بچنے کے لیے یہ جاب کا تکلیف دہ ڈھول اسے گلے میں لٹکانا پڑا تھا۔
صبح ہمیشہ وہ دیر سے آفس پہنچتی تھی۔ آج بھی



UrduPhoto.com

گاڑی نے راستے میں کافی خوار کیا اور جب وہ دفتر پہنچی تو میٹنگ شروع ہو چکی تھی۔ آفس کے اصول کے مطابق میٹنگ روم میں اب اس کا داخلہ ممنوع تھا لہٰذا وہ متوقع بے عزتی سے بچنے کی خاطر اپنے کیبن میں آ کر بیٹھ گئی۔

میٹنگ تقریباً" تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ اس دوران اشفا کا سیروں خون خوامخواہ جلتا رہا۔ میٹنگ کے اختتام پر لنچ شروع ہو گیا اور اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر باس نے اسے آفس بلا کر بے بھاؤ کی سنائیں۔ جب وہ آفس سے نکلی تو منہ سوجا ہوا تھا۔ دل ہی دل میں اس گنجے جاپانی باس کو گالیوں سے نوازتے وہ پارکنگ میں آئی تو گاڑی کو غائب پایا۔

"ہیں.... یہ گاڑی کہاں گئی۔" اس نے فکر مندی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ وہ گاڑی کی چابی نکالنا تو جلدی میں بھول گئی تھی لہٰذا وہ کسی چور اچکے یا پھر ایڈونچر کے شوقین مزاج انگریزوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ پولیس کو بتانے کا فائدہ نہیں تھا کیونکہ اب تک وہ لوگ گاڑی کے ٹائر وغیرہ اور قیمتی پارٹس اتار کر کسی سنسان سڑک پر چھوڑ کر چلے گئے ہوں گے۔

اشفا نے تھک ہار کر ٹیکسی کو اشارہ کیا اور پھر جلتی بھنتی گھر چلی آئی۔ ماما کو گاڑی کا بتا کر شامت بلوانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا لہٰذا خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

دوسرے دن اس نے تیاری کے دوران پاپا کو کہتے سنا۔

"کل بارہ بجے کی فلائٹ ہے ہماری، تم اشفا کو بھی بتا دو۔"

"اشفا کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کی بھی پیکنگ کر دی ہے۔" ماما نے لاپرواہی سے کہا تو اشفا سلگتے ہوئے ان کے سر پر پہنچ گئی۔

"ماما! میں پاکستان کیسے جا سکتی ہوں۔ نئی نئی جاب ہے، چھٹی بھی ملنا مشکل ہے جبکہ...."

"ہمیں آپ کی اس نام نہاد جاب سے کوئی غرض نہیں۔ آپ کی ماما کی صحت ٹھیک نہیں، لہٰذا آپ خوامخواہ انہیں ٹینشن نہ دیں۔" پاپا نے نرمی سے اس کی گفتگو کو منقطع کر کے کہا تو وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

"مگر پاپا...."

"نو اگر، مگر۔" وہ مسکراتے ہوئے بریف کیس اٹھائے باہر نکل گئے۔

"ماما! میرا جانا کیا بہت ضروری ہے؟"

"اشفا...." انہوں نے خفگی سے اسے گھورا تو وہ پاؤں پٹختی باہر نکل گئی۔ اس کا موڈ بری طرح آف تھا۔ کوئی بھی بہانہ کامیاب نہیں رہا تھا۔ وہ رات بھر سے لے کر پاکستان آنے تک ماما، پاپا سے خفا خفا رہی۔

ایئرپورٹ پر کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیونکہ پاپا نے انہیں آج کے دن آنے کا نہیں بتایا تھا۔ وہ لوگ کچھ دیر لاہور میں موجود اپنے ماموں کے گھر ٹھہرے رہے اور پھر وہ اور پاپا اکیلے گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ ماما کو ماموں نے بصد اصرار روک لیا تھا۔

گاؤں پہنچنے تک بھی اس کا موڈ بگڑا رہا۔ اپنے کزنز سے مل کر اسے قطعاً" کوئی خوشی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان سب کی محبت کے جواب میں اس کا رویہ خاصا سرد رہا تھا۔ جیسے شاید سب اس کی جھجک محسوس کر رہے تھے۔

اس کے دادا حیات حسین کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

سب سے بڑے تایا ابو تھے۔ ان کا ایک بیٹا مرتضیٰ اور دو بیٹیاں نمرہ اور ثانیہ تھیں۔ رابعہ تائی ان کی دوسری بیوی تھیں انہی سے ان کی دو بیٹیاں تھیں جبکہ مرتضیٰ ان کی پہلی بیوی سے تھا جو کہ اس کی پیدائش پر وفات پا گئی تھیں۔

پھر نجمہ پھوپھو تھیں جو کہ بیوگی کے بعد اپنے والد کے گھر میں ہی اپنے چار بچوں ثمن، سائرہ، عاشر، عامر کے ہمراہ مقیم تھیں۔ ان کے بعد اس کے پاپا ہارون حیات تھے۔ اشفا ان کی اکلوتی بیٹی تھی جو کہ ان کی شادی کے تقریباً" سات سال بعد پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس کے بعد دو مزید بھائی بھی ہوئے مگر وہ کم سنی میں ہی وفات پا گئے تھے۔



سب سے چھوٹے مرسلین چچا تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ تقی اور نقی اور دو ہی بیٹیاں تھیں۔ مہوش اور عروبہ۔ مہوش سب سے بڑی تھی۔ انتہائی مغرور اور نک چڑھی سی یہ کزن تو اشفا کو سرے سے ہی پسند نہیں آئی تھی۔

ان کی آمد کے ساتھ ہی گھر میں اک عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ دادی اپنے جوڑوں کے درد کو بھلائے ملازموں کو مختلف ہدایات دے رہی تھیں۔ گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ دوسرے دن ماما بھی خوب لدی پھندی سی چلی آئیں۔ سارا دن عجیب سی بھگدڑ مچی رہی۔ اسے ماما سے تنہائی میں بات کرنے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ وہ جب بھی ان کے قریب جاتی کوئی نہ کوئی انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

ثمن اور سائرہ سے اس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ لیکن آج کے دن تو وہ بھی کافی مصروف تھیں۔ اشفا غصے کے اظہار کے طور پر اپنے کمرے میں جا بیٹھی۔ اسی پل ماما کو بھی گویا فرصت مل گئی تھی اس کے پاس آ گئیں۔ ماما نے آتے ہی والہانہ انداز میں اسے ساتھ لپٹا کر ماتھا چوما۔ نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں سرخ اور بھیگی بھیگی سی محسوس ہو رہی تھیں۔

"میری بیٹی خفا خفا سی لگ رہی ہے۔" ان کی آواز بھی قدرے بھرائی سی تھی۔ اشفا چونک سی گئی۔

"آپ کو میری خفگی کی پروا ہے؟"

"اتنی بدگمان کیوں ہو رہی ہو بیٹیا! کیا والدین اولاد کے لیے بھی غلط سوچ سکتے ہیں۔" ماما نے نرمی سے اس کے الجھے بال سمیٹے۔ اشفا ایک مرتبہ پھر چونک سی گئی۔

"ماما! آپ واضح لفظوں میں بات کیوں نہیں کرتیں۔ یہ مبہم گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

وہ ماما اور پاپا کے انداز دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس کی چھٹی حس بھی کچھ انوکھا ہو جانے کا پیغام دے کر اسے الرٹ کر رہی تھی۔

"ابھی کچھ دیر بعد تمہارا اور مرتضیٰ کا نکاح ہے۔"

"کیا...." اشفا چلا اٹھی تھی۔

"آہستہ...." ماما نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا تو وہ ان کا ہاتھ جھٹک کر بے یقینی کے عالم میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"آپ ایسا نہیں کر سکتیں ماما۔ آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔"

"ابھی کچھ دیر بعد مولوی صاحب تمہاری رضا مندی معلوم کرنے کے لیے آنے والے ہیں۔ اسی لیے تمہیں بتایا ہے۔ خوامخواہ شور مت کرو۔ ہونا وہی ہے جو میں اور تمہارے پاپا چاہیں گے۔" انہوں نے انتہائی نرم لہجے میں کہہ کر گفتگو کو سمیٹا تو اشفا حیرت، دکھ، صدمے کی وجہ سے گنگ ہی رہ گئی تھی۔

"ماما! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ کوئی گائے بھینس نہیں کہ جس کھونٹے سے باندھا بندھ گئی۔ آپ میری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتیں۔"

"تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو اشفا! ہماری امیدوں، تمناؤں کا واحد مرکز، یہ خواب، یہ خواہش میری ہی نہیں تمہارے باپ کی بھی ہے، اس خواب کا تعلق تمہارے تایا اور دادی سے بھی ہے۔ کیا تم ہماری محبتوں، چاہتوں کا صلہ یہ دو گی۔ کیا تم بھری برادری کے سامنے اپنے باپ کے سر کو جھکا دو گی۔ کیا تم ان سب کے ان خدشات پر مہر لگاؤ گی۔ کیا تم اپنے عمل سے یہ ثابت کر کے دکھاؤ گی کہ یورپ میں پلنے والی ساری اولادیں اسی طرح نافرمان، ضدی اور بدلحاظ ہوتی ہیں۔ کیا تم میری تربیت کا مذاق بناؤ گی۔ اگر ایسا کچھ ہوا تو اللہ کی قسم تم اپنی ماں کا چہرہ عمر بھر نہ دیکھ سکو گی۔ اتنی ذلت کے بعد میں جی کر کروں گی بھی کیا۔ لوگ تھوکیں گے مجھ پر کہ یہ تربیت کی ہے میں نے اپنی اکلوتی اولاد کی۔ مجھ سے ایک بچی کی پرورش بھی نہ ہو سکی۔" عطیہ کی آنکھیں مسلسل بہہ رہی تھیں۔ ان کی آواز رندھ چکی تھی۔ شاید مزید بولنے کی ان میں سکت نہیں رہی تھی۔

اسی پل دروازہ کھلا اور پاپا دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے اندر آئے۔ ان کے پیچھے تایا ابو اور دو اور بھی

بزرگ آدمی تھے۔ اشفا کو لگا کہ پھانسی کا پھندا اس کی گردن کے قریب کسا جا رہا ہے۔ اسے سولی پر چڑھانے کے لیے لوگ آ چکے تھے۔

اس کے اندر نفرتوں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ یہ ڈرامہ بہت خوش اسلوبی سے کھیلا گیا تھا۔ اسے بے وقوف بنا کر سب ہی ہنسی خوشی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس نے باپ کے چہرے کی طرف دیکھنا چاہا تو آنسوؤں کی دھند نے ہر منظر دھندلا دیا۔ اس کی جی چاہ رہا تھا وہ ابھی اٹھے اور چیخ چیخ کر سب کو بتائے کہ ان لوگوں نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ یہ شادی سراسر فراڈ ہے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے سگے ماں، باپ اس کے ساتھ ایسا کریں گے۔ پہلے اسے ان لوگوں کی چاہتوں اور جھوٹی محبتوں کا بہلاوا دے کر پاکستان لائے اور پھر زبردستی اپنے پینڈو، اجڈ بھتیجے کے ساتھ اپنی اتنی لائق اور قابل بیٹی کا نکاح کر دیا۔ ماما کی طرح پاپا نے بھی جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا لے کر اس کی زبان پر زبردستی تالا لگانا چاہا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اشفا کی تمام سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ اسے تو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کے خلاف آنسو بہانا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر ان کی صورتیں دیکھتی رہی۔ احتجاج اور بغاوت کے متعلق ذہن نشین تمام باتیں اس کا منہ چڑاتی رہیں۔

"اگر میں امریکہ میں ہوتی تب بھی یہ لوگ میرے ساتھ ایسا کرتے؟" اس نے حیرت و بے یقینی سے خود سے سوال کیا۔

"ابھی تو مجھے یہاں آئے دو دن بھی نہیں ہوئے اور ماما نے کتنی چالاکی سے تمام ڈرامہ رچا لیا ہے۔ اب کتنی خوش اور مطمئن لگ رہی ہیں۔ دنیا کی ساری مائیں کیا ایسی ہوتی ہیں۔ ظالم اور روڈ۔" اس نے اذیت سے لب کچلے تو نچلے ہونٹ سے خون کی بوند ٹپک پڑی۔

"کیا میں اب اپنی ساری زندگی اس پرانے طرز پر بنے کھنڈر مکان میں روتے تڑپتے گزار دوں گی۔"

اشفا کا دل اک پل کے لیے اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا تو وہ بے ساختہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں، کبھی نہیں۔"

"ایک کھیل ان لوگوں نے میرے ساتھ کھیلا ہے اور ایک کھیل میں ان لوگوں کے ساتھ کھیلوں گی۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"شطرنج کی بساط تو ان لوگوں نے بچھائی ہے۔ مہرے بھی اپنی مرضی سے رکھ لیے۔ اب گیم کے اختتام کا انتظار کریں۔ ہار جیت کا فیصلہ تو ابھی ہونا باقی ہے۔" وہ سرخ آنکھیں لیے بڑی بے خونی کے عالم میں سوچ رہی تھی۔

"میں اب تمام عمر ان جاہلوں کے ساتھ رہوں، جو بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں لے کر عالم فاضل بن کر بیٹھ گئے ہیں اونہہ....." اشفا نے غصے سے اپنے بال نوچے۔

"ماما! میرا معیار کیا اتنا گھٹیا تھا جو آپ نے میرے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔" وہ ایک مرتبہ پھر ماں سے متنفر ہو کر سوچ رہی تھی۔

"آپ کیسی ماں تھیں کہ بیٹی کی کسی خواہش کا آپ کو پتا نہیں چل سکا۔ کیا میں نے ایسی زندگی کی تمنا کی تھی۔" پہلی مرتبہ ایک سرکش آنسو آنکھ کے کنارے سے پھسل پڑا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی کا اختیار آپ کو دیا تھا مگر آپ نے اسے بڑے ناجائز انداز میں استعمال کر ڈالا ہے۔ کیا میں نے ایسے آدمی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جو دن بھر زمینوں پر ٹریکٹر چلائے، میرا آئیڈیل یہ ہے کیا۔ ایک انتھک محنت کرنے والا کسان۔" اس کا پورا وجود زہر زہر ہو رہا تھا۔

"میں ایسے آدمی کے ساتھ زندگی گزاروں جو اچھے مستقبل کا لالچ لیے روشنیوں کی دنیا میں جانے کا خواہشمند ہو۔" اس کے سامنے مرینہ کی ویران آنکھیں اور بے رنگ زندگی کے مناظر لہرائے۔

"ان لوگوں کے جو خواب ہیں وہ تو میں کبھی بھی پورے نہیں ہونے دوں گی۔" اشفا نے اک عزم سے



سوچا۔

"ابھی تو پاپا نے ماما کی بیماری کا ڈراوا دے کر زبردستی کر لی ہے مگر آئندہ زندگی میں میں کسی کو اپنے اوپر اختیار نہیں دوں گی اور وہ دبو سا مرتضیٰ بھلا اس کی کیا جرأت ہے۔ میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی اگر اس نے مجھے چھوا۔"

اسے پاکستان آئے ابھی بیالیس گھنٹے نہیں ہوئے تھے اور اس تمام عرصے میں اس نے صرف ایک مرتبہ گاؤں کی کچی پکی سڑک پر پسینے سے شرابور میر مرتضیٰ کو دیکھا تھا اور اس وقت وہ اسی مرتضیٰ کے متعلق اندازے لگائے بڑے بڑے پلان سوچ رہی تھی۔

اس بات سے بے خبر کہ وہ کوئی لکی جیسا کمزور اور ڈرپوک بندہ نہیں اور نہ ہی یاسر جیسا بزدل ہے۔ جو اشفا کی گالیوں کے جواب میں بھی من من کر رہا ہے۔ وہ لکی نہیں تھا جو سہاروں کی تلاش میں نیویارک کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔

وہ یاسر بھی نہیں تھا جو گرین کارڈ کے لالچ میں ایک لڑکی نہیں بلکہ کئی لڑکیوں کے جذبات و احساسات سے کھیلتا رہا تھا۔

وہ تو محمد میر مرتضیٰ حیدر تھا جس کے قدموں کی دھمک سے زمین لرز اٹھتی تھی۔ وہ اپنے بابا میر حیات حیدر کا ولی عہد اور قریب قریب کے تمام گوٹھوں کے بسنے والوں کے دلوں پر راج کرنے والا میر مرتضیٰ تھا۔

اس گاؤں میں نہ کوئی چوہدری تھانہ رعایا۔ سب انسان برابر تھے سب کسان محنتی تھے، سب زمیندار جرأت مند تھے۔

میری مرتضیٰ میں اور اس کے مزارعے دین محمد میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ فرق میر نے اس بھادوں کی سہانی شام کو مٹا ڈالا تھا جب اس کے بابا نے اس کے سر پر اپنی دستار رکھ دی تھی۔ اسے اس دستار کا بھرم رکھنا تھا۔

اس نے پشت ہا پشت سے قائم دائم بہت ہی پرانی فرسودہ روایات کو توڑ ڈالا۔ اس نے گاؤں میں اسکول کی بنیاد رکھی۔

اس نے نہری پانی کو انصاف کے ساتھ زمینداروں اور مزارعوں کے مختصر رقبوں میں دنوں کے حساب سے تقسیم کر کے اس بے انصافی کو مٹایا۔

اس نے چھوٹے زمینداروں کو اپنے بل بوتے پر ٹیوب ویل لگوا دیے۔

یہ وہ میر مرتضیٰ تھا جب زمینوں کے دورے پر کبھی دوسرے گوٹھ جاتا تو لوگ اس کا استقبال اتنا شاندار کرتے گویا وہ کسی ریاست کا شہنشاہ ہے۔

اور مائی میراں تو کہتی تھی کہ میر واقعی ہماری ریاست کا شہنشاہ ہے۔ میر جب بھی گوٹھ جاتا۔ مائی میراں کی جھگی میں چند لمحوں کے لیے ضرور ٹھہرتا اور پھر مائی میراں اسے اپنا پسندیدہ گیت سناتی۔ اگرچہ وہ بوڑھی ہو چکی تھی مگر اس کی آواز میں جوانی جیسی مستی اور رس تھا۔ اتنی رسیلی آواز شاید ہی کسی کی ہو۔

اے راجہ حسن دا، صدا راج مانے
کدی پھیرا پاول، غریباں دے ڈیرے

مائی خاص اس کے لیے میٹھے پانی کی تازہ مچھلی منگواتی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی اور گھی میں تلنے کے بعد نمک لگا کر اس کے سامنے پیش کرتی۔

اور اس وقت مکرم جان کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑتیں جب مرتضیٰ بہت شوق سے مچھلی کو ابلے چاولوں کے ساتھ تناول کرتا۔ کیا مکرم جان جانتا نہیں تھا کہ میر مرتضیٰ کو مچھلی کی بو کتنی ناپسند ہے۔

مائی میراں ایک مرتبہ پھر سرائیکی زبان میں پنجابی کا اپنا پسندیدہ گیت گنگناتی۔

ہے راجہ حسن دا، صدا راج مانے
کدی پھیرا پاول، غریباں دے ڈیرے

وہ سوچوں میں گم ابھی تک گم سم سی بیٹھی تھی جب سائرہ، ثمن اور نمرہ بھاری پیکٹ اٹھائے ہنستی مسکراتی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"وڈیری ماں (تائی امی) نے آرڈر دیا ہے کہ ان کی اکلوتی حسین و جمیل بہو یہ شاندار نفیس لباس فاخرہ زیب تن فرمائیں اور اس کے بعد ملک کی نامور بیوٹیشن ثمن آپ کی نوک پلک سنواریں گی کیونکہ



UrduPhoto.com

نیچے رسم کے لیے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔"
ثانیہ نے میک اپ کا سامان بیڈ پر پھیلایا اور نمرہ اس کے کپڑے نکالنے لگی۔ اشفا غائب دماغی سے اس تمام کارروائی کو دیکھ رہی تھی۔
"پہلے تم چینج کر آؤ۔" ثمن نے اشفا سے کہا تو وہ سنبھلتے ہوئے چینج کر بولی۔
"میں یہ کپڑے نہیں پہنوں گی۔"
"ارے اشفا ڈیئر! ہمارے یہاں دلہنیں ایسے ہی کپڑے اپنی شادی کے موقع پر زیب تن کرتی ہیں۔" سائرہ نہ جانے کیا سمجھی تھی۔ فوراً" ہی سمجھانے والے انداز میں بولی تو اس کے چہرے پر ناگواری پھیلتی چلی گئی۔

"مجھے تیار نہیں ہونا' اور نہ ہی میں ایسے کپڑے پہنوں گی۔"
"تمہیں یقیناً" یہ بھاری لہنگا دیکھ کر الجھن ہو رہی ہے مگر فکر نہیں کرو' رسم کے بعد اتار دینا۔ لیکن فی الحال تو تمہیں یہ کپڑے پہننا ہوں گے۔ کیونکہ دلہن لہنگا نہ پہنے تو وہ دلہن نہیں لگتی۔"
نمرہ نرمی سے مسکرائی تو اشفا ان کی فضول بک بک سن کر جھنجلا گئی۔ اسی پل عطیہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ انہیں صورت حال سمجھنے کے لیے بس کچھ پل ہی لگے تھے۔ انہوں نے بچیوں کو نرمی سے مختلف کاموں کے لیے چند منٹوں کے لیے باہر بھیجا اور پھر اشفا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ بس اتنا ہوا تھا کہ جب نمرہ' ثانیہ لوگ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئیں تو اشفا روئی روئی آنکھیں لیے لہنگا پہنے بیٹھی تھی اور عطیہ چاچی کمرے میں پھیلی چیزیں سمیٹ رہی تھیں۔
انہوں نے نمرہ کو اشارہ کیا۔ ثمن نے آگے بڑھ کر اشفا کا میک اپ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب تک وہ تیار کرتی رہی تھی عطیہ ان کے قریب بیٹھی ہلکی پھلکی باتیں کرتی رہیں۔ میک اپ کے بعد اشفا کے سر پر دوپٹہ سیٹ کیا گیا اور اس کے بعد عاشر کیمرہ اٹھائے اندر چلا آیا۔ ایک اور ناقابل برداشت کام۔
عامر کسی ماہر فوٹو گرافر کی طرح ہدایات دے رہا تھا اور عاشر تصویریں اتار رہا تھا۔ "بھابھی! یوں کریں' ایسے کھڑی ہوں۔ ویسے کھڑی ہوں۔" اشفا کا لال بھبھو کا چہرہ دیکھ کر عطیہ نے عاشر کو منع کیا کہ اس وقت کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔
پھر جب نمرہ' ثانیہ اسے تھام کر نیچے لائیں تو اتنے لوگوں کے بیچ میں مرکز نگاہ بن کر بیٹھنا اور بھی دشوار ہو گیا۔ تائی امی اسے آتا دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھیں' پھوپھو نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔ تائی امی نے اس کے سر سے ڈھیروں پیسے لگا کر خیرات کیے' محبت سے پیشانی چوم کر ڈھیروں دعائیں دیں۔
"میری دھی رانی تو رج رج کے سوہنی ہے۔" وہ بڑے فخر کے عالم میں سب کو بتا رہی تھیں۔ لوگوں کی حسد اور رشک سے بھری نگاہیں اشفا کا طواف کر رہی تھیں۔
اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ کسی اور کی رتجگے کی سرخی لیے لہو رنگ نگاہیں بھی اس کے گرد چکرا رہی ہیں۔
اشفا اس بات سے بے خبر تھی کہ کسی اور کا دل اس پل لہو لہو ہو رہا ہے۔ کسی اور کے دل کی سرزمین اجڑ رہی ہے۔ دل کے شہر میں تلاطم برپا ہے۔ دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ خواب کا محل گر رہا ہے اور امنگیں دم توڑ چکی ہیں۔
اشفا اپنے ہی غم کو سینے سے لگائے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے کسی اور کی خبر بھی کیا ہوتی۔ اس پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ احتجاج کرتی بھی تو کیا یہ ظلم کرنے والا کوئی اور نہیں تھا بلکہ اس کے اپنے والدین تھے۔
اپنے خود ساختہ غم میں نڈھال اسے پتا نہ چلا کہ کب مہوش اس کے برابر آکر بیٹھ گئی ہے۔ وہ چونکی تو تب جب مہوش کی دھیمی غراتی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
"کسی اور کی جاگیر پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے تم نے۔ مرتضیٰ کو پکے کاغذوں میں اپنے نام کر لیا ہے۔ تیری سیدھی سادی بھولی ماں تو بڑی چالباز نکلی۔" اشفا غائب

دماغی سے اسے سن رہی تھی۔ اس کی توجہ دوسری طرف مبذول ہو رہی تھی جہاں سے شور کی اور اک ساتھ عورتیں اور لڑکیوں کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔

"مرتضیٰ لالا آرہے ہیں۔" نمرہ کے چہکنے کی آواز آئی۔

"مرتضیٰ کا دل تو میری جاگیر تھا۔ اور میں اپنی جاگیر کسی اور کے حوالے نہیں کروں گی۔" وہ چٹکھاڑتے ہوئے اٹھی اور پھر تیزی سے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

نہ جانے اور کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں۔ اشفا تو سن سی بیٹھی رہی گویا پتھر کا مجسمہ ہے۔

اسٹیج پر پاپا اور تایا ابو کے ساتھ مرتضیٰ بھی آیا تھا۔ پھر کچھ دیر بعد اسے وہاں سے اٹھایا گیا۔ پاپا اور تایا ابو نے اسے ڈھیروں پیار کیا۔ تائی امی اور دادی نم آنکھوں سے اسے دعائیں دیتی رہیں۔ بس ثمینہ چاچی اور مہوش کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ مرسلین چاچو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر ڈھیروں روپے تھمائے۔

نمرہ، ثانیہ جس طرح تھام کر اسے باہر لے کر آئی تھیں اسی طرح تائی امی کے کہنے پر دوبارہ تھامے ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں چھوڑ گئیں۔

اشفا نے زندگی میں آج سے پہلے کوئی شادی اٹینڈ نہیں کی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ شادی میں کیا کیا رسومات ہوتی ہیں اور اپنے خاندان کے رواجوں کے متعلق تو وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ اس کے پاپا کے کزن کی دو شادی شدہ بیٹیاں حرا اور افشاں اس کی تنہائی کا احساس کر کے کمرے میں آگئی تھیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ اشفا تھک گئی ہے۔" افشاں نے خیال ظاہر کیا تھا۔ اشفا کو ان دونوں کی موجودگی اور بولنا سخت برا لگ رہا تھا مگر فی الحال وہ انہیں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

"اشفا نے اپنے خاندان کی بھلا کہاں کوئی شادی اٹینڈ کی ہے۔ اسے کیا پتا ہمارے رواج کا؟" حرا بڑی شرارتی نظروں سے اس کے دل میں اتر جانے والے روپ کو دیکھ کر بولی تو افشاں بھی کھلکھلا اٹھی۔ اشفا کا مارے کوفت کے ـــــ بُرا حال ہو گیا۔

"اشفا! اگر تم چاہو تو کپڑے بدل لو۔" اشفا کو خود بھی عجوبہ بن کر بیٹھنا سخت برا لگ رہا تھا۔ مگر وہ ان دونوں کی موجودگی کی وجہ سے خاموش تھی۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ اپنے اس حسین روپ کو نوچ کھسوٹ دے اور اس کمرے کی سجی سجائی چیزوں کو تہس نہس کر دے۔ یہ کمرہ یقیناً" مرتضیٰ کا تھا۔ اس نے پورا گھر ابھی دیکھا ہی کہاں تھا کہ اسے سب کے کمروں کے متعلق اندازہ ہوتا۔

"تم یقیناً" مرتضیٰ کا انتظار کر رہی ہو مگر یار! کیا پتا ہے کہ ہماری خاندانی رسم کے مطابق مرتضیٰ آج رات ادھر نہیں آئے گا لہٰذا تم اطمینان رکھو۔" حرا نے مسکراتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"چلو آج کی رات تو جان بخشی ہو گئی ورنہ شوہر کو بھگتنا کوئی آسان ہے۔" افشاں نے رازداری سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اشفا کو ان کا ہنسی ٹھٹھول زہر لگ رہا تھا۔

"تم شکر کرو یار! کہ تمہاری ساس بہت اچھی ہیں ورنہ شوہروں کے ساتھ ساتھ خطرناک ساسوں سے نبٹنا بہت مشکل ہے۔"

"تو اور کیا رات بھر میاں کو بھگتو ان کا جی بہلاؤ اور دن بھر سسرالیوں کے نخرے برداشت کرو۔" افشاں نے ایک اور کھنکتا قہقہہ لگایا۔

"ویسے تم خوش نصیب ہو اشفا! کہ تمہیں مرتضیٰ جیسے شخص کا ساتھ ملا ہے۔ اس جیسا تو کوئی ہے ہی نہیں، اگر مجھے ابھی بھی مرتضیٰ کی طرف سے شادی کی آفر ہوتی تو میں ایک منٹ کی بھی دیر نہ لگاتی۔" حرا انتہائی دلسوزی سے بولی تھی۔ انداز میں بھرپور شرارت تھی۔ وہ دونوں بہنیں بہت زندہ دل تھیں مگر اشفا کو ان کی زندہ دلی اور خوش مزاجی بہت چبھ رہی تھی۔

"یہ خاتون مرتضیٰ سے پورے نو سال بڑی ہیں۔" افشاں نے رازداری سے اشفا کے قریب جھک کر کہا تو



حرا بلبلا اٹھی۔

"تم نے ایک سال زیادہ کر دیا ہے۔ میں صرف آٹھ سال بڑی ہوں مرتضیٰ سے۔"

"صرف آٹھ سال۔" افشاں نے آنکھیں پھیلائیں۔

"آٹھ سال کا فرق اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔" حرا ڈھٹائی سے بولی تھی۔ اسی پل اس کا تین سالہ بیٹا بھاگتا ہوا آیا تو وہ اپنے بیٹے کو چومنے لگی تھی۔

"ویسے یار! مجھے تو مرتضیٰ بچارے پر ترس آرہا ہے۔ آخر اس کا حق ہے کہ وہ اپنی خوب صورت بیوی کا جی بھر کر دیدار کرے۔" افشاں نے تاسف سے سر ہلایا تو حرا نے بھی بھرپور تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ اس وقت ایک ملاقات کا ہونا بہت ضروری ہے۔" حرا پر سوچ انداز میں بولی۔

"تم اپنا خیال اپنے پاس رکھو، اگر ملاقات طویل ہو گئی تو ہماری تمہاری پیشی لگ سکتی ہے۔" افشاں نے مسکراتے ہوئے حرا کے خیال کو رد کیا تو وہ بھی تائید میں سر ہلانے لگی۔

"اس نقطے پر تو میں نے غور نہیں کیا۔"

"تم کسی بھی نقطے پر غور نہیں کر رہیں۔ دیکھ نہیں رہی ہو کہ دلہنیا کچھ بے زار سی ہو رہی ہے لہٰذا اپنے اس لاڈلے کو اٹھاؤ جو کہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اپنی ممانی کو دیکھ رہا ہے بلکہ گھور رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں نیند بھی بھری ہے۔" افشاں نے بھانجے کو اک پیار بھری چپت لگا کر حرا سے کہا تو اسے بھی اشفا کی تھکاوٹ کا ایک دم احساس ہوا۔ لہٰذا وہ دونوں اسے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلی گئیں تو اشفا نے اک طویل پرسکون سانس خارج کی۔ ان دونوں کی اس طویل گفتگو میں جو بات اشفا کو پسند آئی تھی بلکہ اس کے دل کو لگی تھی۔ وہ مرتضیٰ کے نہ آنے کی خوشخبری تھی۔ اس کے کندھوں پر سے منوں بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ چند گھنٹوں کے لیے ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔

"تھینک گاڈ۔" اس نے کپڑے بدلنے کا تردد نہیں کیا تھا۔ اس قدر تھکن ہو رہی تھی کہ بس جیولری کو اتارنے کی ہمت کر سکی۔ مگر جوں ہی بستر پر لیٹی تو اک نامعلوم سی بے چینی نے گھیراؤ کر لیا۔

"میں اور مرتضیٰ ـــ اف، میں نے کبھی ایسا سوچا نہیں۔ تم کبھی مجھے نہیں پا سکو گے مرتضیٰ۔ تم میرا آئیڈیل نہیں۔ میری اور تمہاری سوچیں مختلف ہیں، میرے اور تمہارے راستے مختلف ہیں، منزلیں مختلف ہیں مگر پھر ان بزرگوں نے ایسا کیونکر کیا۔ پاپا میں آپ سے ناراض ہوں، میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی اور یہ مرتضیٰ آج نہیں تو کل ضرور اس کمرے میں آئے گا۔ وہ مجھے چھونے کی کوشش کرے گا، حق جتائے گا اور میں اسے واضح لفظوں میں بتا دوں گی کہ میں کوئی معمولی لڑکی نہیں ہوں۔ اور یہ کہ میں اسے قطعاً" پسند نہیں کرتی بلکہ اس رشتے کے بعد تو مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی ہے۔ وہ اسی قابل ہے کہ اس کی شادی اسی خاندان کی کسی لڑکی کے ساتھ ہوتی۔

میں اسے بتا دوں گی کہ ماما نے مجھے اپنے آنسوؤں اور بیماری کی بلیک میلنگ سے اس سے شادی کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور یہ کہ وہ اب میری مجبوری کا مزید فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ میں اسے اتنا ذلیل اور شرمندہ کروں گی کہ وہ میرے ساتھ نگاہ اٹھا کر بات نہیں کر سکے گا۔ اس پینڈو جاہل کو بھلا بات کرنے کا سلیقہ ہی کہاں ہو گا۔ زرعی یونیورسٹی سے ایم اے کر کے اس نے بڑا تیر مار لیا ہے۔ گھٹیا انسان۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اسے مجھ جیسی لڑکی خوش قسمتی سے مل جائے گی۔"

اور بھی نہ جانے کون کون سی منفی سوچوں نے اس کے ذہن کو آلودہ کر رکھا تھا۔ نہ جانے کب سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگی۔ اس کا ذہن اسی وقت بے دار ہوا جب ہلکے سے کھٹکے کی آواز آئی۔ وہ ایک دم ٹھٹک کر اٹھ بیٹھی تھی۔ مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھول کر اس نے اپنے سامنے دیکھا تو حیرت سے ایک جھٹکا سا لگا۔

صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے سفید لباس اور سفید ہی پگڑی نما صافے کو سر اور گردن سے سندھی انداز



UrduPhoto.com

میں لپیٹے وہ پوری آنکھیں کھولے مسکرا رہا تھا۔ نہیں وہ مسکرا نہیں رہا تھا۔ اشفا کو غلط فہمی سی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر قدرے جھجکتے ہوئے دیکھا وہ یک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھیں' نہ جانے یہ کیسی آنکھیں تھیں۔ اتنی عجیب اور سحرزدہ کر دینے والی آنکھیں' نہیں بلکہ خوف زدہ کر دینے والی آنکھیں' بے حد روشن چمکیلی اور گہری سیاہ مقناطیسی کشش لیے لمحہ بہ لمحہ مسکراتی آنکھیں۔

یہ وہ مرتضیٰ حیدر نہیں تھا جسے اس نے پرسوں کڑکتی دوپہر میں ڈیرے کی کچی پکی سڑک پر دیکھا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی مرتضیٰ حیدر تھا۔ آنکھوں میں غرور کی چمک لیے' تفاخر سے بیٹھا اس کے پل پل بدلتے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا انہی گہری لمحہ بہ لمحہ مسکراتی آنکھوں سے۔

اس نے ان آنکھوں کے بارے میں کہیں پڑھا تھا۔ وہ ایک انگریز غیر شہرت یافتہ غریب سا مصنف تھا جس کا خوش قسمتی سے ایک ناول کتابی شکل میں آگیا تھا۔ اس ناول کے عنوان کا صفحہ بھی پھٹ چکا تھا۔ یہ ناول اسے آنٹی ڈیزی کے اسٹور سے بڑی خستہ حالت میں ملا تھا۔

اس ناول میں روم کے کسی شہزادے کا ذکر تھا۔ ناول میں شہزادے کے حسن کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ خصوصاً "اس کی آنکھوں کی..... ان آنکھوں میں بھی دنیا کو سکندر اعظم کی طرح فتح کر لینے کی چمک تھی مگر وہ روم کا شہزادہ محبت میں ناکام ہو گیا تھا اور اس ناکامی نے اس کے دل کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر ڈرتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔ مرتضیٰ کی آنکھوں میں بھی کچھ انوکھی سی چمک تھی۔ اگرچہ اب وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس سے خوف محسوس ہو رہا ہے کیا؟" اس نے خود سے سوال کیا اور پھر بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

"ہرگز نہیں۔" اشفا نے یقین سے سوچا۔

"تو یقیناً" یہ اس کی شخصیت کا رعب ہے۔" ایک اور سوالیہ نشان ذہن میں روشن ہوا تو وہ چپ سی رہ گئی۔

"مجھے سرتاپا دیکھ کر اگر تسلی کر لی ہے تو کچھ کہوں....." انداز اجازت لینے والا نہیں تھا نہ ہی طنز بھرا تھا مگر اشفا کو یوں محسوس ہوا کہ وہ ایسے بہت کچھ جتا گیا ہے۔

"تم میرے اس کمرے میں آنے کی توقع نہیں کر رہی تھیں یقیناً"۔" اس کا انداز ناقابل فہم تھا۔

"مگر افسوس میں نے ہمیشہ دوسروں کی توقعات کے خلاف کام کیا ہے۔" اس نے دوسروں کہہ کر ایک مرتبہ پھر اسے جتایا تھا۔

"تمہارے نزدیک یہ شادی بہت آناً" فاناً" ہوئی ہے مگر یہاں سب لوگ پچھلے تین چار مہینوں سے تیاریاں کر رہے تھے۔" اشفا کے اعصاب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ وہ یوں بول رہا تھا گویا روٹین کی باتیں ہوں۔ شاید اسی لیے اشفا کے بھی ذہن نے کام کرنا شروع کر دیا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم ایک مرتبہ پھر یاد آگئے ساتھ ہی تنفر کی ایک تیز لہر من میں اٹھی۔

"میرے نزدیک اس رشتے کی سرے سے کوئی اہمیت ہے اور نہ ہی میں نے اس شادی کو تسلیم کیا ہے۔"

"تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم نے نکاح نامے پر دستخط کر دیے یہی بہت ہے۔ مسئلہ تو تب بنتا جب تم انکار کرتیں اور پھر مجھے گن پوائنٹ پر تم سے سائن کروانے پڑتے۔ اپنی عزت اور انا کا سودا میں کسی حال میں بھی نہیں کرتا۔" اس کا لب و لہجہ کافی سخت تھا اور آواز دھیمی۔

"میں انکار بھی کر سکتی تھی۔" اشفا ایک دم پھنکاری۔

"پھر کیا کیوں نہیں۔" وہ ہی سخت لہجہ اور دھیمی آواز۔

"ماما اور پاپا کی وجہ سے' مگر تم مجھے بزدل یا ڈرپوک مت سمجھنا۔ میں صرف اور صرف مجبور ہو گئی تھی۔"

"بزدل' ڈرپوک۔" مرتضیٰ ابھی تک سامنے لگی



پینٹنگ کو ہی بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر مصنوعی حیرانی سے دہرانے لگا۔

"اچھا' تو تم بہت بہادر ہو۔"

"مجھے تم سے' تمہارے اس گھر سے شدید نفرت ہے۔ میرا بس چلے تو میں تمہیں شوٹ کر دوں۔" اشفا ایک مرتبہ پھر چلائی۔ وہ اسی طرح چلا چلا کر مرتضیٰ پر ظاہر کر دینا چاہتی تھی کہ وہ اسے قطعاً" پسند نہیں کرتی اور یہ کہ وہ اپنی حدود میں رہے۔

"اس نفرت کی کوئی خاص وجہ۔" وہ گویا اس کی ہر بات کا مذاق اڑا رہا تھا۔ انداز بھی کافی پر سوچ تھا۔ اشفا اک بگولا ہو گئی۔

"تم میرا آئیڈیل نہیں ہو۔"

"تمہارا آئیڈیل کیا ہے؟"

"وہ میں تمہیں کیوں بتاؤں" اس نے بھرپور تنفر سے غصیلے لہجے میں کہا تو مرتضیٰ نے نگاہوں کا زاویہ بدلا۔

"اتنا اونچا مت بولو کہ مجھے بھی جواباً" آواز بلند کرنی پڑے۔"

"بولوں گی' ضرور بولوں گی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے۔ اتنی غیرت ہوتی تو اتنا سب کچھ سننے کے بعد اس کمرے سے اٹھ کر چلے جاتے مگر تم جیسے....."

"بس....." وہ اس قدر بلند آواز میں بولا تھا کہ اشفا کا دل لرز کر رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا تو اشفا نے خود کو داد دینی چاہی۔

"مجھے ایسا پہلے ہی بول دینا چاہیے تھا۔" اشفا نے مسرت بھرے انداز میں سوچا۔ مرتضیٰ تیز نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ جان بوجھ کر لاپروا بن گئی۔ وہ باہر نہیں گیا تھا بلکہ کمرے میں دو تین قدم چل کر رکا۔ شاید اپنے غصے کو کنٹرول کر رہا تھا۔ لیکن یہ اشفا کی خام خیالی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے جیب میں سے موبائل نکال کر کسی مکرم جان سے بات کی۔ موبائل آف کر کے اس نے صوفے پر پھینکا اور بولا۔

"عورت پر ہاتھ اٹھانا مردانگی نہیں بلکہ مردانگی کی توہین ہے۔" وہ آہستہ آہستہ چل کر اس کے قریب آیا۔ اس کی نگاہیں اس کے سراپے پر تھیں۔ اشفا نے پلکیں اٹھا کر دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ وہ ہی ساکت کر دینے والی سیاہ آنکھیں' نہ جانے اس کی آنکھیں اتنے رنگ کیوں بدلتی تھیں۔

"جو مرد عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ وہ میری ڈکشنری میں بزدل مرد ہوتے ہیں۔ اس کمزور مخلوق جو آپ کے رحم و کرم پر ہے اور صرف زبان ہی چلا سکتی ہے اس پر ہاتھ اٹھانا کہاں کی بہادری ہے۔" اب وہ اس کے قریب بیٹھ چکا تھا۔ اشفا دم بخود سی رہ گئی۔

"میں تمہیں صرف زبان سے سمجھانا چاہتا ہوں۔ اور تم بھی اچھی بیویوں کی طرح صرف زبان کی بات سمجھنا۔" مرتضیٰ نے بہت سہولت سے اس کا سادہ بغیر مہندی لگا دودھیا گداز ہاتھ پکڑ کر بغور دیکھا اور بولا۔

"جو کچھ ابھی کہہ چکی ہو اسے میں اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاف کرتا ہوں۔ آئندہ بھی تمہاری زبان پر یہ الفاظ نہ ہوں۔" وہ ہی دھیمی آواز اور رعب دار لہجہ۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔" وہ انتہائی بدتمیزی سے بولی تھی۔

"آئندہ تم کبھی اس انداز میں بات بھی نہیں کرو گی۔" اس نے دائیں ہاتھ سے اس کا چہرہ تھاما اور بایاں بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر کے گویا اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اشفا کا دل خوف سے کانپ اٹھا تھا۔

"میں اپنی باتیں بار بار دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔" اشفا نے اس کی گرم سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کیں۔ وہ پیچھے ہٹنا چاہ رہی تھی مگر صرف پھڑپھڑا کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"دیکھو مجھے چھونا نہیں' ہاتھ نہیں لگانا مجھے پلیز چھوڑو۔" بے ربط سے چند جملے اس کے سرخ لبوں سے آزاد ہوئے تو اک مضبوط ہاتھ نے اس کے لبوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا۔ خوف اور اس کے



UrduPhoto.com

ہاتھ کی سختی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور تمام دعوے بھی دھرے کے دھرے رہ گئے۔

"ڈیئر اشفا! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو احمقوں کی طرح اپنے حق سے زبردستی نگاہ چرا لیتے ہیں۔ محض تم جیسی سرکش عورتوں کی وجہ سے تم مجھے بہت مختلف پاؤ گی۔ میں دوسروں کے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں تو اپنے اس جائز اور حسین حق سے کیسے دستبردار ہو جاؤں۔ تم خوب صورت ہو اور تمہارا شوہر ہونے کے ناتے میں تمہیں ضرور سراہوں گا۔" وہ اشفا کے خوب صورت نقوش کی نرماہٹوں کو محسوس کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا تو اشفا دبی دبی آواز میں چیخی۔

"تم میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔"

"میں نے کہا نا کہ اپنے لب و لہجے پر کنٹرول کرو ورنہ نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔" مرتضیٰ نے اس کے خوبصورت بالوں کو جھٹکا دیا تو وہ درد سے بلبلا اٹھی۔

"وحشی، بے ہودہ، جنگلی انسان۔"

"کچھ اور بھی کہہ دو۔" وہ اس کی شدتوں سے گھبرا کر ایک دم ہی گھٹی گھٹی آواز میں رونے لگی تھی۔

صبح وہ کمرے میں تنہا تھی اور مرتضیٰ نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی تمام جیولری سامنے رکھے ٹیبل پر پڑی تھی۔ وہ اٹھی تو ایک دم ہی گردن سے ٹیس سی اٹھی۔ دونوں کلائیوں میں موجود چوڑیاں غائب تھیں اور کلائیوں میں بھی چبھن ہو رہی تھی۔ وہ واش روم سے باہر آئی تو ایک مرتبہ پھر رات کے مناظر آنکھوں کے سامنے لہرائے۔ اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ایک دفعہ پھر دھواں دھار رونا شروع کر دیا تھا۔

"اس نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی۔" اپنے ہی کہے الفاظ اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ تمسخر اڑا رہے تھے۔

"بہت برے ہو مرتضیٰ تم، بہت گھٹیا اور کمینے۔" اس نے غصے کے عالم میں اپنے بال نوچ ڈالے۔ اسی پل دروازے پر دستک ہوئی اور ماما کی آواز بھی سنائی دی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ماما کے ساتھ خوب لڑے جھگڑے مگر نہ جانے کیوں انہیں سامنے پا کر اس کے لبوں پر قفل لگ گئے تھے۔

نمرہ اور ثانیہ اس کے لیے ناشتا لے آئی تھیں۔ تائی امی اور دادی اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔ اسے ان سب کی محبتیں دھوکہ اور دکھاوا محسوس ہو رہی تھیں۔

"اگر یہ میرے اپنے ہوتے تو میری خواہشات کا احترام کرتے۔" وہ اپنی سوچوں میں الجھی تھی جب ثمینہ چاچی کمرے میں داخل ہوئیں۔ تائی امی اور ثمینہ چاچی سگی بہنیں بھی تھیں۔ اسی لیے وہ تائی امی کو بھابھی کی بجائے آپا کہتی تھیں۔ چاچی نے جب تائی امی کی توجہ اشفا کے روکھے آزردہ انداز کی طرف مبذول کروائی تو اشفا بھی ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔

"کیا یہ لوگ میرے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھ رہے ہیں۔" اسے ایک دم سبکی کا احساس ہوا تھا۔ تبھی چاچی تنہائی پاتے ہی اس کے قریب آ بیٹھیں۔

"زبردستی کے رشتے بھی کبھی پائیدار ہوتے ہیں۔ بھائی جان اور ہارون بھائی کو تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ مجھے تو حیرت عطیہ بھابھی کے رویے پر ہے انہیں تو کم از کم ماں ہونے کے ناتے تمہارا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ مگر وہ تو خود ہی..." انہوں نے معنی خیزی سے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس کی سوچوں کو ایک نیا رخ دے کر وہ خود تو اٹھ گئیں جب کے اشفا تھک ہار کر تکیے میں سر دیے بے سدھ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"ماما! آپ مجھے چھوڑ کر چلی جائیں گی۔"

"اشفا! کیا بچپنا ہے یہ۔ سب لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں اور انہیں ماں باپ کا گھر چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ تمہاری یہ خوش قسمتی ہے کہ تم اپنے اصل گھر میں اپنوں کے درمیان رہو گی۔ اور پھر مجھے مرتضیٰ کی طرف سے بھی کافی اطمینان ہے۔ وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا۔ جانا تو ضروری ہے نا۔"



"بڑا خیال رکھتا ہے وہ تو مجھے پتا ہے کہ....." وہ ماما کے سمجھانے پر کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

"ماما! آپ مجھے ان جنگلی لوگوں میں چھوڑ کر جا رہی ہیں۔"

"اشفا! کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ سوچ سمجھ کر بولا کرو۔" عطیہ نے خفگی سے اسے گھورا اور پھر نرمی سے بولیں۔

"دیکھو بیٹا! اب تم شادی شدہ ہو چکی ہو۔ اپنے شوہر اور اس گھر میں دل لگاؤ۔ اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ میری بیٹی کو شاد آباد کرے اور جلد ہی تمہاری گود بھر جائے۔ اگلی دفعہ جب میں آؤں تو اپنی بیٹی کو اتنا مصروف پاؤں کہ میرے لبوں پر یہ شکایت رہے کہ اشفا ہمیں وقت نہیں دے رہی۔" انہوں نے اس کی پیشانی کو چوم کر گلے سے لگایا۔

"اپنی ماما اور پاپا کے متعلق جو بدگمانیاں ہیں انہیں ختم کر دو بیٹا صرف یہی سوچ کر کہ ماں باپ اولاد کا صرف بھلا ہی چاہتے ہیں۔" اشفا کو اگر پتا ہوتا کہ یہ اس کی ماں کا آخری پیار ہے اس کے لیے تو وہ کبھی ماما کو جانے ہی نہ دیتی پاپا کو روک لیتی۔ مگر انسان اپنے رب کے فیصلوں کے سامنے بے بس ہے۔

ایک دم اتنا بڑا صدمہ، اتنا بڑا غم..... والدین کی دائمی جدائی، وہ بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ والدین کا سایہ کتنا ضروری ہوتا ہے۔

اسلام آباد جاتے ہوئے ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ صرف چند گھنٹوں میں ہی زندگی کا تعلق ٹوٹ گیا۔ وہ ان کے بے جان جسموں سے لپٹ لپٹ کر کس قدر روئی تھی۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ اس کے ماں باپ کو اس کی شادی کرنے کی کیوں جلدی تھی۔ وہ اسے مضبوط سائبان دے کر خود مطمئن ہو گئے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کر گئے تھے۔ انہیں بہت جلدی تھی اپنے آخری سفر پر جانے کی۔ انہیں بہت جلدی تھی کہ اشفا اپنے گھر بار کی ہو جائے۔ زمانے کے بے رحم تھپیڑے ان کی نازک سی بیٹی کو توڑ پھوڑ نہ دیں۔

مرتضیٰ، نمرہ، ثانیہ سب کی دلجوئی بھی اس کے اس عظیم صدمے کو ختم نہیں کر سکی تھی۔ دادی اپنے بیٹے کی میت کو دیکھ کر بالکل ہی نڈھال ہو گئی تھیں۔ بابا ابو کے کندھے جھک گئے تھے۔ وہ سب غمزدہ تھے مگر اشفا کو اپنا غم سب سے بھاری لگتا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ہی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے تھے ایک وہ ہی تھی جسے کسی پل سکون میسر نہیں تھا۔

عاشر یونیورسٹی سے فارغ ہو کر ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرنے لگا تھا۔ عامر ابھی تک زیر تعلیم تھا۔ اور پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں مقیم تھا۔ کبھی کبھار چھٹیوں میں یہ دونوں بھائی گھر آتے تو خوب ہی رونق سی ہو جاتی۔

دادی اشفا کو بھی کمرے سے باہر لے آتیں۔ ان کے جانے کے بعد پھر ہر طرف سکوت سا طاری ہو جاتا۔ مہوش اور عروبہ کبھی اپنے پورشن سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ثمن، سائرہ اور نمرہ ثانیہ ہمہ وقت اس کی دلجوئی کے لیے تیار رہتیں۔ گھر میں اگر یہ لڑکیاں نہ ہوتیں تو بالکل ہی اس گھر میں الو بولتے۔ مرتضیٰ اکثر ڈیرے پر ہی رہتا تھا کبھی کبھار جب ضرورت محسوس ہوتی تو گھر آتا۔ یہ اس کی روٹین تھی اور اسے بدلنا بہت مشکل تھا۔

تائی امی اور دادی کے بہت مرتبہ کہنے پر بھی اس نے اپنی روٹین نہیں بدلی تھی۔ وہ ہی بے رنگ سے شب و روز تھے اور وہ ہی اشفا کی سب سے اول روز کی طرح بے زاری۔ مرتضیٰ کی خوش مزاجی اسی طرح قائم دائم تھی اور اشفا کی بے زاریت عروج پر۔ بس اتنا فرق تھا کہ وہ اب مرتضیٰ کے سامنے تڑتڑ نہیں بولتی تھی۔ اول روز کا جو اک رعب و دبدبہ سا اس کے دل پر طاری ہو گیا تھا ابھی تک قائم تھا۔

ہفتے کے روز مرتضیٰ کی گھر میں موجودگی سب کے لیے باعث حیرت تھی۔ اس روز عجیب بات یہ ہوئی کہ مہوش بھی اپنے پورشن سے تشریف لے آئی۔ اشفا کی



UrduPhoto.com

توجہ بھی نمرہ نے اس طرف دلائی تھی۔
"آج لالا دن کے وقت گھر میں ہیں تو یہ محترمہ بھی اپنے بل سے باہر نکل آئی ہیں۔" ثانیہ اور سائرہ کچن میں مصروف تھیں۔ بہت ہی مزے دار پکوانوں کی خوشبو اشفا کو بھی کچن میں کھینچ لائی تھی۔
"یہ کس کے لیے اتنا خاص اہتمام ہو رہا ہے؟" اشفا نے لاپرواہی سے ایک گرما گرم کباب اٹھاتے ہوئے پوچھا تو نمرہ فوراً بولی۔
"آج آپ کے شوہر نامدار ہمارے ساتھ کھانا کھانے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں اسی سلسلے میں تیاریاں عروج پر ہیں۔"
"بھابھو! لالہ تمہیں بلا رہے ہیں۔" ثمن نے کچن میں جھانک کر اشفا سے کہا اور کباب اٹھا کر بھاگ گئی۔ ثانیہ ارے ارے ہی کرتی رہ گئی تھی۔ اشفا کا حلق کڑوا سا ہو گیا۔ وہ ادھ کھایا کباب پلیٹ میں رکھ کر بے دلی سے اوپر آ گئی۔
"آپ نے بلایا ہے۔" انداز لٹھ مارنے والا تھا۔ مرتضیٰ جواب دینے کی بجائے اسے دیکھتا رہا۔ اشفا اس کے مسلسل دیکھنے پر جھنجلا سی گئی تھی۔
"کوئی کام تھا مجھ سے۔"
"ضروری تو نہیں کہ بیوی کو کام کے سلسلے میں ہی بلایا جائے۔"
"آپ تو ہمیشہ کام کے سلسلے میں ہی آواز دیتے ہیں یا پھر مطلب۔۔۔" اشفا نے ایک دم ہی زبان دانتوں تلے دبا کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ مقابل کی آنکھیں اس پل کیسے جگمگ کر رہی تھیں۔ اشفا نے آج تک اسے مسکراتے نہیں دیکھا تھا کیونکہ یہ کام اس کی آنکھیں بخوبی سرانجام دے دیتی تھیں۔
"یعنی کہ تم کہنا چاہتی ہو کہ میں بہت مطلبی ہوں۔" وہ لفظوں کو پکڑنے کے فن سے آشنا تھا اشفا تو کہہ کر پچھتائی۔
"میں جاؤں۔"
"میں نے تمہیں جانے کی ابھی اجازت نہیں دی۔ یہاں بیٹھو۔" اشفا مرے مرے قدم اٹھاتی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھی۔
"اگر تمہیں تین چار چیزوں میں اختیار دے دیا جائے تو تم کس چیز کا انتخاب کرو گی۔ دولت، رشتے، آزادی یا پھر محبت۔"
"یہ کیسا سوال ہے۔" وہ الجھی۔
"یہ بہت اہم سوال ہے۔"
"میں آزادی کا انتخاب کروں گی۔" اشفا نے جھٹ سے کہا۔
"وجہ۔"
"کیونکہ دولت تو میرے پاس پہلے سے موجود ہے اور۔۔۔" وہ سوچنے لگی تو مرتضیٰ نے سختی سے بولا۔
"اور رشتوں اور محبت کی تمہیں ضرورت نہیں لہٰذا آزادی تمہارا انتخاب ہو گی اور وہ بھی مجھ سے۔"
"آپ عقلمند ہیں۔" اس نے کافی کھلے دل سے سراہا تو مرتضیٰ نے کہا۔
"تم بے عقل، احمق اور بے وقوف ہو۔" اشفا کا منہ بن گیا تھا اور غصہ بھی شدید آیا مگر پی گئی۔ زیادہ بولنے کا خمیازہ وہ بھگت چکی تھی۔
"چھوڑو ان باتوں کو میرا سر دباؤ۔ جب بھی پاس بیٹھتی ہو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔" اشفا اس نے حکم پر جی بھر کے تلملائی تھی۔
"گلا نہ دبا دوں۔" اس نے تنفر سے سوچا۔
"زور سے دباؤ۔۔۔" مرتضیٰ نے اس کے ہاتھ کو سختی سے مروڑا تو وہ چلا اٹھی۔
"چھوڑیں میرا ہاتھ۔"
"اگر نہ چھوڑوں تو۔۔۔؟" اس نے ایک مرتبہ پھر اشفا کا نازک ملائم ہاتھ دبایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
"آپ بہت برے ہیں۔" وہ زور زور سے سر دباتے ہوئے بولی۔
"اچھا۔۔۔"
"بہت ظالم بھی ہیں۔"
"یہ نئی اطلاع ہے۔"
"بہت بد دماغ اور غصیلے ہیں۔"



"میری خوبیوں کے متعلق تمہارے پاس کس قدر جامع معلومات ہیں۔" مرتضیٰ نے اسے سراہا۔
"میرا بس چلے نا۔۔۔"
"تو تم میرا سر دبانے کی بجائے گلا دبا دو۔" مرتضیٰ نے اپنے ماتھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر گرفت میں لے کر اک نرم سا بوسہ دیا۔ وہ جھنجلاتے ہوئے پیچھے ہٹی۔
"اپنی حد میں رہیں۔"
"میری حدود کا تعین کر دو۔" بڑی دلربائی سے کہا گیا۔
"آپ خاموشی سے سر دبوائیں، میرے ساتھ فری ہونے کی کوشش نہ کریں۔" وہ ایک ناقابل برداشت کام جانے کیسے دل پر پتھر رکھ کے کر رہی تھی۔ مرتضیٰ کو کافی اطمینان ہوا۔ وہ اسے چڑا کر دلی سکون محسوس کرتا تھا۔
"تو کیا پڑوسیوں کی خواتین سے فری ہونے کی کوشش کروں۔" اس کا موڈ بدل رہا تھا۔ اشفا کو خطرے کی گھنٹی محسوس ہوئی۔
"میں جاؤں۔"
"اوں ہوں۔۔۔ یہاں لیٹو۔" مرتضیٰ نے اپنے برابر جگہ بنا کر اسے زبردستی جھنکا دے کر لٹایا تو وہ چلا اٹھی۔
"آپ بہت بے ایمان ہیں۔"
"کبھی تعریف بھی کر دیا کرو۔" وہ اس کی دسترس میں قیدی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔
"مرتضیٰ آپ۔۔۔" اشفا نے غصے سے اپنا سر اس کے کندھے سے دے مارا۔ پھر دو تین مرتبہ اس نے یہی عمل دہرایا۔ اس نے کروٹ کے بل تھوڑا سا سر اٹھا کر اشفا کے غصیلے چہرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اشفا حیران حیران سی اسے مسکراتا دیکھتی رہی اور پھر اس کی پیش قدمی پر دانت پیس کر رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"کبھی اس حجرے سے باہر بھی نکل آیا کرو۔" آج ہفتے بعد اسے پھر گھر کی یاد آئی تھی اور آتے ساتھ ہی اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی۔
"کوئی اچھے کپڑے نہیں ہیں تمہارے پاس۔" اس کے قدرے بے رنگ سے سلوٹ زدہ گلابی کاٹن کے کپڑوں کو انتہائی ناگواری سے دیکھا گیا تھا۔
"آپ تو روزانہ مجھے شاپنگ کرواتے ہیں۔" اشفا تنک اٹھی تھی۔
"اور یہ جو الماری بھری پڑی ہے یہ کپڑے کیا ہوئے۔"
"اب میں اس حالت میں یہ ریشمی بھاری سوٹ پہنوں۔" اس نے بھی تیز لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے لا دوں گا کسی دن۔" مرتضیٰ نے جان چھڑوانے والے انداز میں کہا تو وہ تپ اٹھی۔
"میں نے منت نہیں کی کہ مجھے نئے کپڑے لا کر دیں۔"
"بہت بولتی ہو تم۔" مرتضیٰ قدرے بھنایا۔
"ایک سوال کرو تو دس جواب ملتے ہیں۔"
"نہیں بولتی، منہ پر ٹیپ لگا لیتی ہوں پھر خود ہی میری جان کھائیں گے کہ خاموش کیوں ہوں میں۔"
"بہت نخرے دکھانے لگی ہو۔" مرتضیٰ نے پرسوچ انداز میں کہا تو وہ بلبلا اٹھی۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں لہٰذا اللہ کے لیے مجھے آرام کرنے دیں۔"
"کیں، میں نے کب ملکہ عالیہ کے آرام میں خلل ڈالا ہے۔" مرتضیٰ مصنوعی حیرت سے بولا۔ وہ سر تک چادر تان چکی تھی۔ مرتضیٰ گہری سانس کھینچتا لائٹ آف کر کے باہر نکل گیا۔
رات کو اس کی واپسی ہوئی تو ہاتھ میں ڈھیروں شاپرز تھے۔ ایک شاپر نمرہ اور ثانیہ کو دوسرا سائرہ اور ثمن کو جبکہ باقی شاپرز اشفا کے کمرے میں بھجوا دیے گئے۔ ساتھ میں اسے باہر آنے کا آرڈر بھی دیا گیا۔
کچھ دیر بعد وہ منہ پھلائے آ گئی تھی۔ مرتضیٰ کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ دادی نے اسے آتا دیکھ کر محبت سے کہا۔
"جادھی رانی، میر پتر تجھے کہیں گھما پھرا لائے سارا



UrduPhoto.com

دن گھر میں چپکی پڑی رہتی ہو۔" یقیناً" دادی نے سفارش کی تھی جبھی شہزادہ عالم اس کی ذات پر احسان کرتے ہوئے اسے باہر آنے کا کہہ کر خود چلے گئے۔

اشفا بھی جلتی بھنتی اس کے پیچھے آگئی تھی۔

"کیا ضرورت تھی اس احسان کی۔" وہ زیادہ دیر کہاں خاموش رہ سکتی تھی۔

"کون سا احسان.....؟" مرتضیٰ نے حیرانی سے سوچا اور پھر سمجھنے والے انداز میں بولا۔

"او اچھا..... ایسے چھوٹے موٹے احسانات ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔" انداز بھرپور شاہانہ تھا۔ وہ جل کر رہ گئی۔

ڈیرے کے قریب گاڑی رکی تو مکرم جان نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ یہ مرتضیٰ کا ملازم خاص تھا۔ ڈیرے پر ہی اس کی بھی رہائش تھی۔ مرتضیٰ نے مکرم کو کچھ ہدایات دیں اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔

"آج تمہیں اپنی فیورٹ شخصیت سے ملواتا ہوں۔"

UrduPhoto.com

"نہ جانے کون ہے؟" اشفا کو تجسس نے گھیرا۔ کچھ دیر بعد گاڑی ایک جھگی کے قریب رکی اور اس جھگی میں سے ایک بوڑھی عورت باہر نکلی۔

"راجہ حسن دا کنج راہ بھل آیا ہے۔" (حسن کا راجہ کیسے راستہ بھول آیا ہے)

"مائی میرا! یہ اشفا ہے میری بیوی۔" مرتضیٰ نے تعارف کروایا تو مائی کھل سی اٹھی۔

"ماں واری! سوہنی ہے رج کے سوہنی۔"

اشفا کو اس بوڑھی کی باتیں سن کر بہت لطف آیا تھا۔ اس نے مائی کی بنائی مچھلی کو بھی بہت شوق سے کھایا۔ وہ اک خوب صورت شام گزار کر واپس آئی تو موڈ کافی خوشگوار تھا۔ راہداری میں ہی مہوش سے ٹاکرا ہو گیا۔ وہ انہیں دیکھ کر اک تنفر سے بھری نگاہ ڈالے بڑے کمرے میں گھس گئی تھی۔

انہی دنوں نجمہ پھوپھو نے ثانیہ کو اپنے بیٹے عاشر کے لیے مانگ لیا تو گھر میں شادیانے گونج اٹھے۔

"لوگ کافی چھپے رستم نکلے ہیں۔" نمرہ ثانیہ کو چھیڑ رہی تھی۔

"بکواس نہیں کرو۔" وہ شرمائی شرمائی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اشفا نے بھی گھر امور میں دلچسپی لی تو تائی امی اور دادی خوشی سے اٹھیں۔

عامر اور نقی، نقی کی آمد کے ساتھ گھر میں مزید رو ہو گئی تھی۔ یہ سب ڈھولکی پر الٹے سیدھے گانو پریکٹس کر کے نہ جانے کون کون سے شہرت یافتہ کی روحوں کو تڑپاتے۔ اس فنکشن میں بھی مر چچا کی فیملی دور دور رہی تھی۔ مہوش نے سرے سے شرکت ہی نہیں کی تھی البتہ عروبہ گھڑی دو گھڑی لیے اپنی والدہ کے ہمراہ آئی تھی۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو زندگی معمول گئی۔ پورے دو ماہ بعد اس نے ایک چاند سے بیٹے جنم دیا تو گھر میں گویا خوشیوں کی بارات اتر آئی۔

تائی امی اور دادی نہال سی غریبوں میں مٹھائیاں پیسے تقسیم کر رہی تھیں۔ ایک ہفتے بعد اس کے شاندار عقیقہ کیا گیا تھا جس میں پورے خاندان شرکت کی۔

یہ تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد کی بات ہے جب ایک اشفا نے مہوش کو بری طرح روتے دیکھا وہ اس تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی کہ اشفا کا دل پسیج انسانی ہمدردی کے ناتے اس کے قریب گئی تو نے اسے ایک عجیب سی داستان سنا ڈالی۔

اشفا گم سم سی اس کے چہرے کی طرف دیکھ

"کیا یہ سچ ہے؟"

"میری آنکھوں میں دیکھ لو۔" وہ زخمی لہجے م اشفا حیرت زدہ سی رہ گئی۔ ان آنکھو رتجگوں کے اتنے عذاب تھے کہ اشفا کو پگھلتا محسوس ہوا۔ یہ عشق تھا یا جنون؟ اشفا سمجھ پائی تھی۔ کیا محبت میں کوئی اس قدر پاگل ہو جا

"تو پھر میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"تم ہی تو سب کچھ کر سکتی ہو اگر چاہو تو۔" مہوش نے لہو رنگ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں کیا کروں؟" اشفا حیران ہوئی۔

"تم چلی جاؤ کہیں دور بہت دور' واپس امریکہ۔"

"امریکہ ....." بہت عرصے سے دلی خواہش کو مہوش نے زبان دے ڈالی تھی۔

"تم بیچ میں نہیں آتیں تو آج مجھے یوں سسکنا نہ پڑتا۔ تمہارے سامنے تو دنیا پڑی تھی اور میرے لیے پوری دنیا صرف مرتضیٰ تھا۔" وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اشفا کے دل پر گر رہے تھے۔

"عطیہ چاچی اور ہارون چچا نے تایا ابو کو مجبور کیا تھا کہ وہ تمہارا رشتہ دیں۔ اگر تایا ابو ہارون چچا کو زبان نہ دے چکے ہوتے تو یہ جنگ میں جیت جاتی مگر..... تم بیچ میں آگئیں۔ میری محبت اور خوشیوں کے درمیان دیوار تم بنی تھیں۔ مرتضیٰ بھی مجبور ہو گیا تھا ورنہ وہ کبھی بھی تم سے شادی نہ کرتا۔ تایا ابو کی کسی بات سے' کسی حکم سے آج تک اس نے سر نہیں اٹھایا تو اس معاملے میں کیسے بول پڑتا۔ اس نے بھی قربانی دے ڈالی مگر نقصان صرف میرے حصے میں آیا۔ سارے عذاب میرے لیے ہیں' سارے غم میری جھولی میں آپڑے ہیں۔ سارے کرب سارے درد مجھ سے چمٹ گئے ہیں۔" وہ کرلا رہی تھی اور اشفا ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"محبت کے اس سفر میں' میں اکیلی تھوڑی تھی مرتضیٰ بھی میرے ہم قدم تھا۔ مجھے اس مقام پر لا کر اس نے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ وہ سب کچھ پا چکا ہے اور میں خالی دامن رہ گئی۔" مہوش کی سسکیاں رات بھر اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اسے آج وجہ معلوم ہوئی تھی کہ مہوش ابھی تک کیوں نہیں شادی کے لیے مانتی۔ ہر رشتے کو انکار مہوش کی طرف سے ہوتا تھا۔ اسے مرتضیٰ کی سنگدلی کا سوچ کر گھن آنے لگی تھی۔ اگر وہ ثابت قدم رہتا تو تایا ابو ضرور اس کی بات مان لیتے مگر وہ بھی سطحی سوچ والا کمزور مرد نکلا۔

خوب صورتی اور دولت کو ترجیح دینے والا۔ وہ مہوش سے زیادہ حسین تھی دولت مند اور تعلیم یافتہ تھی اور مرتضیٰ نے خسارے کا سودا تو ہرگز نہیں کیا تھا۔

ان تمام تلخ سچائیوں کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں دبا غصہ' اس کی نسوانی انا اور غرور کی وہ دھجیاں بھی تھیں جو اس کے ساتھ زبردستی کر کے ماما پاپا نے بکھیر ڈالی تھیں۔

کیا وہ اتنی گری پڑی تھی کہ ماما نے ہاتھ جوڑ کر تایا ابو کو رشتے کے لیے منایا۔ وہ ساری رات روتی رہی اور سوچتی رہی۔

اس نے مہوش کی بات ماننے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ وہ کوئی قربانی نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو صرف اپنے اڈتے اشتعال پر بند باندھنا چاہ رہی تھی۔ وہ ان سب سے اپنے ساتھ کی گئی زبردستی کا بدلہ لینا چاہ رہی تھی۔

وہ ان سب کو جتا دینا چاہتی تھی کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے مگر اس سب کے باوجود ماما پاپا نے خود سے رشتے کی بات کر کے اسے ہلکا کر دیا تھا۔ اسے یہ سب اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔

اگلی صبح اس نے مہوش کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مہوش نے اس کے ساتھ بھرپور تعاون کا وعدہ کیا اور جس رات مرتضیٰ کسی کام کے سلسلے میں سندھ گیا اسی رات چپکے سے مہوش نے اس کی سیٹ کنفرم ہو جانے کی خوشخبری سنائی۔

"تم شازم کو یہیں چھوڑ دو۔"

"نہیں' ہرگز نہیں۔" اشفا نے شدت سے اس کی بات کو رد کیا۔

"دیکھو اشفا ابھی شازم کو لے جانا مناسب نہیں۔ میں موقع کی تلاش میں رہوں گی اور بہت جلد شازم تمہارے پاس ہو گا۔ ابھی صرف تم یہاں سے نکلنے کی کرو۔ ڈرائیور تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

"مگر میرا بچہ۔" اشفا کی ممتا بے چین تھی۔

"شازم اگر تمہارے پاس رہا تو مرتضیٰ تمہیں کبھی چین نہیں لینے دے گا۔ تم جانتی ہو وہ اپنے بچے سے کتنی محبت کرتا ہے۔" مہوش جھنجلائی۔

"میں بھی تو شازم سے بے حد محبت کرتی ہوں۔



میں کیسے رہوں گی اس کے بغیر۔" وہ رو دی تھی۔

"اشفا! میری بات سمجھو اور نکلنے کی کرو۔ تم واپس چلی جاؤ گی۔ یہی تو تمہاری سب سے بڑی خواہش' تو پھر دیر مت کرو۔"

"مگر مہوش! تم سمجھ کیوں نہیں رہیں۔ میں شازم کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"تو پھر ساری زندگی ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارو' جو نہ تم سے محبت کرتا ہے نہ تمہاری عزت۔ جس کی زندگی میں تم زبردستی شامل ہوئیں۔ اگر سمجھوتہ کرنا چاہتی ہو تو رہو اس زندان میں۔" مہوش نے تلخی سے کہا۔

"اپنے ٹوٹے وقار کی کرچیوں کو سمیٹتی رہو۔ سب جانتے ہیں کہ تم ان چاہی ہو۔ تمہارے ماں باپ نے تایا ابو کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے کہ ان کی بگڑی بیٹی کو قبول کر لیں۔" مہوش نے چنگھاڑ کر کہا تو اشفا کی ہمت جواب دے گئی۔ اب جو وہ فیصلہ کر چکی تھی اس پر عمل بہت مشکل امر تھا اور یوں وہ مہوش کی باتوں کے جال میں پھنس گئی' وہ شیطان کے بہلاوے میں آکر اپنی جنت کو ٹھوکر مار آئی۔ وہ خود غرض بن گئی۔ اس نے اپنی انا پر ممتا کو قربان کر دیا۔ وہ اپنے دو ماہ کے شازم کو بلکتا چھوڑ آئی۔

امریکہ پہنچ کر اسے یوں لگا وہ ایک دم خالی خالی ہو گئی ہے۔ اس نے تمام رابطے توڑ دیے' بس مہوش سے ہی کبھی کبھی فون پر بات ہوتی وہ بھی صرف شازم کے لیے ہی کہ اس کی خیریت کا پتا چلتا رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد مہوش نے تمام نمبرز بدل دیے تو وہ نام نہاد رابطہ بھی ٹوٹ گیا۔

یہاں آکر اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ گھر اگرچہ بند تھا مگر اس کی حالت کافی خستہ تھی۔ سب سے بڑی پریشانی تو یہ تھی کہ ہوٹل پر کسی انڈین نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ وہ انڈین پہلے ہوٹل کا منیجر تھا اور اب مالک بنا بیٹھا تھا۔ گھر بھی پتا چلا کہ اسی منیجر نے کسی اور انگریز کے ہاتھ فروخت کر ڈالا ہے اور وہ انگریز فیملی چھٹیاں گزارنے کسی اور شہر میں گئی ہے۔

اس تمام صورت حال نے اشفا کے اعصاب بے جان کر ڈالے۔ مرینہ سے رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک دم حالات نے کروٹ بدلی تھی۔ اس نے سب سے پہلے ایک فلیٹ کرائے پر لیا۔ بینک سے رقم نکلوائی اور منیجر کے خلاف مقدمہ درج کروایا۔ ساڑھے چار سال مقدمہ کورٹ میں چلتا رہا اور بالآخر وہ نا صرف مقدمہ جیت گئی بلکہ منیجر انیل کو قید بامشقت کی سزا بھی سنا دی گئی اور جرمانہ بھی کافی سارا اسے ادا کرنا پڑا۔

جس شام وہ مقدمہ جیت کر کورٹ سے نکلی اسی شام مقامی مارکیٹ میں اس سے مرینہ کی ملاقات ہوئی۔ وہ اکیلی نہیں تھی اس کے ساتھ ایک بڑی عمر کا صاف رنگت والا آدمی بھی تھا۔ مرینہ نے اس کا تعارف اپنا شوہر کہہ کر کروایا تو اشفا کو بے حد حیرانی ہوئی۔ اشفا نے دیکھا کہ مرینہ بے حد خوش ہے۔ اس کے چہرے پر اطمینان ہے اشفا کو دلی خوشی محسوس ہوئی۔

مرینہ سے ملاقات کے بعد اشفا کو احساس زیاں مزید کچوکے لگانے لگا۔ وہ جو کچھ کھو چکی تھی اسے امید نہیں تھی کہ وہ دوبارہ اس سب کو پالے گی۔ ایک دن وہ مرینہ کے پوچھنے پر پھٹ پڑی اور اس نے کتاب زیست کا صفحہ صفحہ اسے سنا ڈالا۔ مرینہ تاسف سے سنتی رہی اور جب بولی تو اس کے لہجے میں یقین تھا۔

"تم لوٹ جاؤ اشفا! یقیناً" تم اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کو پالو گی۔"

"وہ بہت انا پرست ہے وہ مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا۔" اشفا نے روتے ہوئے کہا۔

"ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں' پھر اس کے پاس تمہارا بچہ ہے۔" مرینہ نے اسے پاکستان بھیجنے کے لیے اور مرتضیٰ سے معافی مانگنے کے لیے تیار کر لیا۔ وہ بہت ہمت' حوصلے اور امید کے دیے کو تھام کر پاکستان آئی تھی۔ مگر پہلے ہی قدم پر مہوش کے رویے نے اسے توڑ ڈالا تھا۔ وہ ابھی تک بے یقین سی بیٹھی تھی کہ یہ وہی مہوش ہے۔

"مجھے معاف کر دیں دادی جان۔" وہ ان کی گود میں



UrduPhoto.com

سر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔
"تم نے ایسا کیوں کیا دھی رانی! کیا ہم سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔" دادی کی بوڑھی آنکھیں بھی نم تھیں۔
"دادی جان! مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میں کیسے شازم کو چھوڑ کر چلی گئی۔ آج بھی سوچتی ہوں تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔" وہ شازم کو سینے سے لگائے رنجیدگی سے بولی۔
"مما! اب نہ جانا۔۔۔" شازم نے اپنے نرم منے سے ہاتھ کو ماں کے گال پر رکھ کر کہا تو وہ اس کی اس معصوم ادا پر مسکرا اٹھی۔ اسی پل ثانیہ بھی اپنے چھوٹے بیٹے کو اٹھائے چلی آئی۔
"توبہ یہ شازم تو بہت تیز نکلا۔ ماں کو دیکھ کر فوراً" گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیا ہے اس نے۔" ثانیہ اسے ماں سے لاڈ کرتے دیکھ کر خوش دلی سے بولی۔
گھر میں پہلے سے ہی خوشگوار ہلچل سی تھی۔ تائی امی سے پتا چلا کہ نمرہ اور عامر کی شادی قریب ہے۔ پھوپھو نے دونوں بیٹوں کے لیے بھتیجوں کو مانگ لیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ جب گھر میں بیٹیاں موجود ہیں تو پھر باہر کیوں دیکھیں۔
عاشر اور ثانیہ لاہور میں مقیم تھے اور شادی کے سلسلے میں ہی ان کی آمد ہوئی تھی۔ عامر کو بھی آفس کی طرف سے گھر مل گیا تھا۔ شادی کے بعد نمرہ بھی لاہور شفٹ ہو جاتی۔ اس تمام عرصے میں سائرہ اور ثمن بیاہ کر کراچی اور ایبٹ آباد چلی گئی تھیں۔
مہندی سے ایک رات قبل ان کی آمد ہوئی تھی۔ اشفا کو دیکھ کر انہیں بھی خوشگوار حیرت نے گھیرا۔ اگرچہ سب اس سے بدگمان تھے' نہ جانے مہوش نے کیا بتا کر ان سب کو اس سے متنفر کیا تھا اور پھر اس کا اپنا عمل بھی قابلِ معافی نہیں تھا اس کے باوجود تایا ابو اور دادی نے اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں۔ بس اک خوف تھا تو صرف مرتضیٰ کی طرف سے' نہ جانے اس کا رویہ کیا ہو۔ یقیناً" وہ اس دفعہ اعلا ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکے گا۔
اس نے بہت ہمت اور اعتماد کے ساتھ شازم کے ہمراہ مرتضیٰ اور اپنے مشترکہ کمرے میں قدم رکھا تھا۔
اسے اپنے روٹھے پیا کو منانا تھا۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا تھی اور میر محمد مرتضیٰ حیدر کو بتانا تھا کہ وہ اس سے کتنی محبت کرنے لگی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ مرتضیٰ اس کی کسی بات پر یقین نہیں کرے گا مگر پھر بھی وہ پر اعتماد تھی۔
"وہ میری محبت سے کہاں تک بھاگے گا۔" اس نے یقین سے سوچا۔
"مجھے اسے منانے کے لیے اگر گڑگڑانا بھی پڑا' اس کے قدموں میں جھکنا بھی پڑا تو میں جھک جاؤں گی۔" وہ شازم کو سلاتے ہوئے مسلسل مرتضیٰ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ جوں ہی اس کی نگاہ شازم کے چہرے اور کھلی آنکھوں پر پڑی تو وہ چونک اٹھی۔
"آپ ابھی تک نہیں سوئے بیٹا۔"
"مما! نیند نہیں آ رہی۔" شازم نے اس کے بازو میں سر گھسا کر باریک سی آواز میں کہا تو وہ اس کی پیشانی پر سے بال ہٹا کر چومتے ہوئے بولی۔
"کیوں نیند نہیں آ رہی مما کی جان کو۔"
"شازم بابا کے پاس سوتا ہے نا۔" اس نے معصومیت بھری وجہ بتائی تو اشفا نے چونک کر دیکھا۔
"کیا بابا روزانہ گھر آتے ہیں رات کو۔"
"شازم کے لیے آتے ہیں' پھر جب شازم سو جاتا ہے پھر چلے جاتے ہیں۔"
"ایں' آپ کو یہ بات کس نے بتائی۔" اشفا نے حیرانی سے پوچھا۔
"نمرہ پھوپھو نے۔"
"پھر آج اور کل بابا کیوں نہیں آئے۔" اشفا کو تجسس سا ہوا۔
"دادو کہتی ہیں انہیں کام ہے اور وہ دور گئے ہیں۔" شازم نے ہاتھ کے اشارے سے سفر کی دوری کا بڑے معصوم انداز میں بتایا تھا۔
"دادو نے یہ نہیں بتایا کہ کب آئیں گے؟"
"نائیں۔۔۔" اس نے نفی میں دائیں بائیں سر



ہلایا۔
"مما!۔"
"جی جان۔"
"اب شازم کو ڈر تو نہیں لگتا۔"
"نہیں"
"اچھا بھلا وہ کیوں؟"
"اس لیے کہ اب مما جو شازم کے پاس ہیں۔"
اشفا کو خود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ کیسی سنگدل ماں تھی جو اپنے معصوم بچے کو تنہا چھوڑ گئی۔ اس وقت جب اسے ماں کی شدت سے ضرورت تھی۔
"مما۔" شازم نے اسے سوچوں میں گم دیکھ کر بازو ہلایا تو وہ چونکی۔
"مما! اب آپ کہیں مت جانا۔ بس شازم کے پاس رہنا۔"
"میں اپنے بچے کے پاس رہوں گی ہمیشہ۔" اشفا نے اس کے معصوم خدشات کو رفع کیا۔ "اب سو جاؤ بیٹا! میں آپ کو کہانی سناتی ہوں۔" اشفا نے اسے کہانی سنانا شروع کی تو وہ چند منٹوں میں ہی گہری نیند سو گیا۔
اگلے دن مہندی کی رسم مشترکہ تھی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ صبح سے ہی شروع تھا۔ پہلی مرتبہ اشفا بھی ہر کام میں پیش پیش تھی۔ سب کو ہی اس کے رویے میں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ رات کو مرتضیٰ بھی آ گیا تھا اسے خبر ہو چکی تھی اشفا کے آنے کی۔ شاید اسی لیے وہ مردان خانے سے نہیں آیا تھا بلکہ شازم کو وہیں بلا لیا گیا۔
اشفا مہندی کی رات بہت توجہ سے تیار ہوئی تھی۔ وہ اپنے حسن سے آگاہ تھی۔ اسی لیے جب گرین کلر کا سوٹ جس کے گلے دامن اور آستین پر سلور کام ہوا تھا پہنا تو گویا اس کا پورا وجود جگمگانے لگا تھا۔ اس نے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا۔ کسی کی سیاہ رنگ بدلتی آنکھوں کے حصار میں رہنا تھا۔
وہ بھرپور تیاری کے ساتھ جب نیچے آئی تو رسم شروع ہو چکی تھی۔ عاشر اسے آتا دیکھ کر خفگی سے بولا۔
"اب آئی ہیں آپ' بمشکل تو میں بہانے سے مرتضیٰ کو گھسیٹ کر لایا تھا مگر آپ نے سارا پروگرام غارت کر دیا۔"
"مرتضیٰ! کہاں ہیں؟" اس نے دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پوچھا۔
"چلا گیا ہے' اسے ہوٹل کے انتظام کو دیکھنا تھا۔" عاشر نے خفگی سے بتایا تو اشفا کا چہرہ اتر گیا۔
"اور شازم۔۔۔" وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر شازم کو تلاش کر رہی تھی۔
"وہ بھی اسی کے ساتھ گیا ہے۔"
"مگر شازم کو تمہیں نہیں جانے دینا تھا۔" اشفا پریشانی سے بولی۔
"شازم تو اکثر مرتضیٰ کے ساتھ جاتا رہتا ہے۔"
"اچھا۔۔۔" اشفا نے حیرت سے کہا۔
"وہ مرتضیٰ کو تنگ کرے گا۔"
"نہیں۔۔۔ وہ مرتضیٰ کو تنگ نہیں کرے گا۔ بلکہ دور دور کے دوروں پر تو وہ خوشی خوشی باپ کے ساتھ جاتا ہے۔" عاشر نے بتایا اور پھر ثانیہ کو آواز دیتا پلٹ گیا تو اشفا بھی مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر سجا کر رسم میں شرکت کی غرض سے صحن میں چلی گئی۔
رات مرتضیٰ اور شازم کی واپسی بہت دیر سے ہوئی تھی۔ مرتضیٰ نے سوئے ہوئے شازم کو احتیاط سے اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اشفا اسی کے کمرے میں رہ رہی ہے۔ وہ اشفا کی ڈھٹائی بلکہ بے شرمی پر حیرت زدہ تھا کوئی اور عورت ہوتی تو شرمندگی کے مارے منہ چھپائے پھرتی۔ لوگوں کی باتوں کے خوف سے گوشہ نشین ہو جاتی مگر یہ اشفا ہارون تھی جو کہ چھ سال پہلے رات کی تاریکی میں اپنے کم سن بیٹے کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ اپنی ممتا پر کیچڑ اچھلتے دیکھ' سن کر بھی بڑی ڈھٹائی سے اسی گھر میں رہ رہی تھی۔
اس نے اپنی ممتا کو خواہشات اور آرام پر قربان کر دیا۔ لوگوں کی زبانیں تو نہیں روکی جا سکتیں۔ مرتضیٰ نے خود کچھ خواتین کی گفتگو سنی تھی۔
مرتضیٰ کمرے میں داخل ہوا تو اسے بیڈ پر نیم دراز



Urdu Photo.com

پایا۔ اشفا جاگ رہی تھی۔ یہ بھی ایک حیران کر دینے والا واقعہ تھا۔ اسے اپنی نیند اور آرام کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ وہ سوتی جاگتی تھی اور اکثر جب مرتضیٰ اسے گہری نیند سے جگا دیتا تو ان دونوں کی لڑائی کا ہونا لازمی تھا۔ اسے یاد تھا جب ایک مرتبہ ساون کی پہلی بوند نے کمرے کی کھڑکی پر دستک دی تو مرتضیٰ نے اشفا کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"بارش۔" مرتضیٰ نے سرگوشی نما آواز میں کہا تو اشفا تپ اٹھی۔

"آپ نے بارش کا بتانے کے لیے میری نیند خراب کر ڈالی۔" غصے کے مارے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے کہ غصے میں تم بہت خوب صورت لگتی ہو۔" مرتضیٰ نے اسے چھیڑا تو وہ آگ بگولا ہو گئی۔

"کیوں جگایا ہے مجھے، اب مجھے دیر تک نیند نہیں آئے گی۔"

"تو میں بھی کب چاہتا ہوں کہ تم سو جاؤ۔ اپنی نیند کی بڑی پروا ہے برابر لیٹے شوہر کی بے چین کروٹوں کا کچھ خیال نہیں۔ اتنے دنوں بعد آیا ہوں، تمہیں تو میرے آگے پیچھے پھرنا چاہیے تھا دل بہلانے کا کچھ سامان کرنا چاہیے تھا مگر یہاں تو نیند ہی کسی پل پوری نہیں ہوتی۔"

"کتنے جھوٹے ہیں آپ، روز تو رات کو آجاتے ہیں اور نیند میری کیسے پوری ہو، اتنا تو جگاتے ہیں آپ۔" وہ واقعی بہت منہ پھٹ اور بے حد بولڈ تھی۔ ہر بات بغیر لگی لپٹی کے کہہ دینے والی اگرچہ کافی مرتبہ اسے بہت غلط سلط بول لینے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ وہ کیا بول گیا ہے۔

"روز آجانے کا طعنہ دل کو لگا ہے۔" مرتضیٰ نے مسکرا کر اس کے بالوں کو چھیڑا تو وہ جھنجلائی۔

"ہاتھ مت لگائیے گا مجھے۔"

"کیا کر لوگی۔" مرتضیٰ نے مزید ایک عدد بھرپور شرارت کر ڈالی تو اس کا غصہ سوا نیزے پر پہنچ گیا۔ "میں چیخ کر سب کو بتاؤں گی کہ آپ رات کو چوری چھپے آتے ہیں۔"

"او... او یہ غضب نہ کرنا۔" اس نے جان بوجھ کر ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ "ویسے آج کیوں طعنوں کی بوچھاڑ کر ڈالی ہے۔" مرتضیٰ نے اس کی روشن پیشانی پر ہاتھ رکھا اور کروٹ کے بل قدرے اونچا ہو کر اس کے تنے تنے نقوش کو میٹھی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"مجھے چھونے کی کوشش نہ کریں۔" وہ اس کی مزید پیش قدمی کو روکنے کی غرض سے تنبیہی لب و لہجے میں بولی۔

"تم کبھی بھی اچھی مزاحمت نہیں کر سکیں۔" سیاہ آنکھیں اب مسکرا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کیا طلسم تھا کہ جب بھی وہ اسے اس انداز میں دیکھتا اشفا خود بخود نرم پڑ جاتی۔

"میں... میں آپ سے ہرگز بات نہیں کروں گی۔" اسے جب کوئی سخت الفاظ نہ سوجھے تو وہ جھنجلا کر بولی۔

"یہ اچھی دھمکی ہے۔" مرتضیٰ نے مسکراتے ہوئے اس کے گرد بازوؤں کے حلقے کو مزید تنگ کیا تو وہ بھنچی آواز میں بلبلائی۔

"مرتضیٰ......"

"مرتضیٰ......" شازم کو بیڈ پر لٹا کر وہ جوں ہی پلٹا اشفا کے لبوں نے جنبش کی دوسرے ہی پل وہ اس کے مقابل تھی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"تم سے مطلب۔" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"مرتضیٰ! آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ میری بات سنیں۔ میں آپ کی تمام بدگمانی دور کر دوں گی۔ پلیز آپ مجھے موقع تو دیں اپنی صفائی پیش کرنے کا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے بولی تو مرتضیٰ نے تنفر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور بولا۔

"مجھے تمہاری بات نہیں سننا۔ آئندہ مجھے



روکنے کی کوشش مت کرنا۔"

"کیوں نہ روکوں، میں آپ کی بیوی ہوں۔"

"بہت جلد یاد آگیا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔" مرتضیٰ کا لہجہ زہر زہر تھا۔ اشفا پشیمان سی نگاہ جھکا گئی۔

"ہٹو......" مرتضیٰ نے چنگھاڑ کر کہا جبکہ اشفا اسی طرح دروازہ تھام راستہ روکے کھڑی رہی۔

"سنا نہیں تم نے۔"

"نہیں سنا۔" وہ بھی تپ اٹھی تھی۔

"میں کہہ رہا ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ لگاؤں گا دو ہاتھ۔"

"آپ جب تک میری بات نہیں سنیں گے میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔" وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی۔ مرتضیٰ نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر جھٹکے سے اسے دروازے کے سامنے سے ہٹایا اور پھر خود تیز قدموں سے چلتا باہر نکل گیا جبکہ اشفا دم بخود سی کھڑی رہ گئی۔

یہ وہ مرتضیٰ تو نہیں تھا جو اشفا کی قربت کے لیے بہانوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ یہ تو کوئی اور مرتضیٰ حیدر تھا۔ اشفا کو ایک دم محسوس ہوا تھا کہ ان دونوں کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اگلا دن بارات کا تھا۔ بھرپور مصروفیت کا دن، اشفا تمام خیالوں کو جھٹک کر ثانیہ اور سائرہ کے ہمراہ مختلف کام سرانجام دے رہی تھی۔ آتے جاتے کبھی مرتضیٰ بھی نظر پڑ جاتی، مگر جس طرح وہ اسے نظر انداز کر رہا تھا، یہ سب اشفا کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور توہین آمیز تھا۔ اشفا تو اس کی بھرپور محبت اور بے باک اظہار کی عادی تھی۔ اس سے مرتضیٰ کا یہ رویہ برداشت نہیں ہو پا رہا تھا۔

چونکہ فنکشن کی ارینج منٹ ہوٹل میں تھی۔ لہٰذا سب ہی تیار ہو کر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور ہوٹل میں پہنچ گئے۔ آخر میں اشفا اور شازم تیار ہو کر نکلے تو پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اشفا نے شازم کو باہر بھیجا، تاکہ وہ دیکھ کر آئے کہ کوئی گاڑی موجود ہے۔ تھوڑی دیر بعد شازم منہ لٹکائے آگیا۔

"مما! گاڑی تو کوئی نہیں۔ اب ہم کیسے جائیں گے؟"

"اچھا۔ ٹھہرو میں عاشر سے فون پر بات کرتی ہوں۔" اشفا نے خود کو تسلی دے کر عاشر کو فون کیا تو وہ سرعت سے بولا۔

"بھابھی! آپ تیار رہیے، مرتضیٰ بس پہنچنے ہی والا ہو گا۔"

"بابا ہمیں لینے کے لیے آ رہے ہیں۔" اس نے شازم کو تسلی دی اور خود کچن میں مصروف ملازموں کو کچھ ہدایات دے کر صوفے پہ آکر بیٹھ گئی۔ شازم بے چینی کے عالم میں اندر باہر کے چکر لگا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد گاڑی کے ہارن سنائی دیا تو وہ اچھل کر بولا۔

"مما! جلدی آئیں۔"

اشفا اپنی ہی جھونک میں چلتی گاڑی تک آئی تو گاڑی کے پاس ادب سے سر جھکائے کھڑے مکرم جان کو دیکھ کر سلگ اٹھی۔

"بابا! کدھر ہیں؟" شازم نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر بے چینی سے پوچھا۔ اشفا کو بھی مجبوراً پیچھے بیٹھنا پڑا تھا۔

"وہ مہمانوں کی وجہ سے نہیں آسکے۔ ان کے کچھ دوست ابھی ابھی پہنچے ہیں۔" مکرم نے شازم کو تو مطمئن کر دیا تھا، مگر اشفا مسلسل سلگ رہی تھی۔

میرج ہال میں پہنچ کر بھی اس کا موڈ سخت آف رہا۔ اس نے غصے میں کھانا بھی نہیں کھایا، بس منتیں کر کے شازم کو کھلاتی رہی۔ رخصتی کے بعد دلہن اور دولہا نے گھر ہی آنا تھا۔ لہٰذا جلد ہی ہوٹل سے فارغ ہو گئے۔

گھر آکر اشفا نے غصے کے عالم میں چوڑیاں اتاریں، میک اپ صاف کیا۔ جیولری اتاری اور پھر زبردستی شازم کو تھپک تھپک کر سلایا۔ وہ مسلسل ریں ریں کر رہا تھا۔ مرتضیٰ کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا، مگر اشفا نے اس کی ایک نہ سنی۔



UrduPhoto.com

"آج بابا نے شازم کو پیار بھی نہیں کیا' اٹھایا بھی نہیں۔" اس نے ڈھیروں شکایتیں اکٹھی کر کے رکھی تھیں۔ اشفا اسے سمجھاتی رہی۔

"وہ مصروف تھے بیٹا! ابھی بابا آپ کو آکر بہت پیار کریں گے۔ اب سو جاؤ۔"

"نہیں سونا شازم کو۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"چلو شاباش میں کہانی سناتی ہوں' شازم آنکھیں بند کرے۔" اشفا نے اسے پچکار کر کہا تو وہ رونے لگا۔

"شازم! میں ماروں گی آپ کو۔"

"بابا پاس جانا ہے۔" وہ منمنایا۔

"جاؤ' چلے جاؤ بابا کے پاس۔" اشفا نے غصے سے کہا۔

"شازم اکیلا کیسے جائے مما! شازم کو ڈر لگے گا۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"آپ شازم کو بابا پاس چھوڑ آئیں۔" وہ اس کی گردن پر ہاتھ رکھے بازو پر سر رکھے معصومیت سے بولا۔ شازم کی مسلسل ضد کی وجہ سے وہ اپنی بے عزتی بھلا کے مرتضیٰ کو فون کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

"کیا تکلیف ہے؟" اشفا کی آواز سن کر دوسری طرف سے کٹیلے لہجے میں پوچھا گیا تو وہ بڑے ضبط کے ساتھ بتانے لگی۔

"مجھے کوئی تکلیف نہیں' آپ کے بیٹے کو ہی درد اٹھ رہا ہے۔"

"کیا ہوا ہے شازم کو۔" وہ پریشانی کے عالم میں تقریباً" چیخا۔

"آپ کی یاد آرہی ہے۔"

"اوہو... میری بات کرواؤ شازم سے۔" اس نے ریسیور شازم کو پکڑایا' تو اس نے دھواں دھار رونا شروع کر دیا۔ مجبوراً" مرتضیٰ کو گھر آنا پڑا تھا۔

"میرے بیٹے کو کیا ہوا ہے۔" اس نے شازم کو بانہوں میں بھینچ کر چوما' تو وہ سوں سوں کرتے ہوئے بولا۔

"مما نے ڈانٹا ہے۔ غصہ کیا ہے کہ شازم سو جائے' مگر شازم نے بابا کے پاس سونا تھا۔" اشفا دانت پیس کر رہ گئی تھی۔

"ایک تو یہ بچے بھی ناں" اس نے چیزیں سمیٹتے ہوئے زیرلب کہا۔

"چلو میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاتا ہوں۔" اکثر جب شازم ضد کرتا تو وہ اسے بھی ڈیرے پر لے جاتا تھا' مگر اس وقت شازم نے ایک مرتبہ پھر منمنانا شروع کر دیا۔

"مما بھی شازم کے ساتھ چلیں۔ شازم مما کے پاس بھی سوئے گا۔"

"بہت فتنے ہو تم۔" مرتضیٰ نے لب بھینچ لیے۔

"بابا! مما سے کہیں ناکہ وہ بھی چلیں۔"

"آرام سے سو جاؤ' بہت ضدی ہو رہے ہو۔" مرتضیٰ نے ڈانٹا تو وہ منہ بسورنے لگا۔

"مجھے بابا کے پاس نہیں سونا' مما پاس سونا ہے۔" باپ کی ڈانٹ سن کر وہ اشفا کے ساتھ چپک گیا تھا۔ ناچاہتے ہوئے بھی اشفا کو ہنسی آگئی۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر بیڈ پر لے آئی۔ مرتضیٰ واپس جانے لگا تو شازم نے پھر پکارا۔

"بابا۔"

"کیا ہے شازم! سوتے ہو کہ نہیں۔" مرتضیٰ پلٹ کر اس کے قریب آیا تو وہ سرعت سے ماں کی گود میں منہ چھپا گیا۔ شازم جو ان دونوں سے چاہتا تھا وہ جانتے بوجھتے اس کی باتوں سے نگاہ چرا رہے تھے۔

"شازم بابا اور مما کے ساتھ سونا چاہتا ہے۔" اشفا کی چادر سے منہ نکال کر شازم نے معصومیت بھرے انداز میں کہا تو مرتضیٰ اس کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اشفا نے دل ہی دل میں شازم کی ڈھیروں بلائیں لیں۔

"میری جان تم نے وہ کام کر دیا ہے جو تمہاری ماں نہ کر سکی۔"

☼ ☼ ☼

عامر اور نمرہ کے ولیمہ کے بعد زندگی معمول پر آگئی تھی۔ مہمانوں کے ساتھ ساتھ سائرہ اور ثمن بھی اپنے



گھروں کو سدھاریں۔ ثانیہ اور عاشر بھی لاہور جا چکے تھے۔ کچھ دنوں بعد نمرہ کو بھی چلے جانا تھا۔

شادی کی مصروفیت کی وجہ سے اشفا اپنے لبوں پر مچلتے ان سوالوں کو تو پوچھ نہیں سکی تھی' جو کہ نوک زبان پر مچل رہے تھے۔ ایک دن موقع پا کر اس نے نمرہ کو گھیر لیا۔ وہ بھی اسے تفصیلاً" ہر بات بتانے لگی تھی۔ اشفا یہ جاننے کو بے تاب تھی کہ مہوش جو کہ یہ چاہتی تھی کہ اشفا اگر چلی جائے تو وہ مرتضیٰ کو حاصل کر لے گی' پھر ایسا کیا ہوا کہ مہوش کو کسی اور کی دلہن بننا پڑا۔ اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ مہوش شوہر سے لڑ جھگڑ کر میکے آئی ہے۔

"مہوش کی اپنی ساس اور نندوں سے نہیں بنتی' اس کا مطالبہ تھا کہ الگ گھر لے کر ——— اسے دیں' تب ہی یہ واپس جائے گی۔ اب دیکھو اس کی خواہش پایۂ تکمیل تک پہنچتی ہے کہ نہیں۔"

"مہوش شادی کے لیے مان کیسے گئی؟" اشفا نے بے چینی سے پوچھا۔

"عمر سلیمن چاچو کے بعد چاچی نے زبردستی عروبہ اور مہوش کی شادی کر دی تھی کیونکہ ———" نمرہ کچھ بتاتے بتاتے ایک دم سوچنے لگی کہ اشفا کو بتانا چاہیے کہ نہیں۔ اشفا کے اصرار پر وہ دبی آواز میں بولی۔

"دراصل جب تم چلی گئیں تو پھر چاچی نے امی اور دادی پہ بہت دباؤ ڈالا کہ مہوش کا رشتہ مرتضیٰ لالا کے لیے لیا جائے' مگر پھر جب مرتضیٰ لالا نہ مانے تو چاچی چپ ہو گئیں۔ انہوں نے پھر مہوش کی کسی ضد کو نہ مانا اور اس کی شادی کر کے ہی دم لیا۔ تقی کو اس کے ماموں باہر لے گئے اور وہیں ان کی بیٹی سے اس کی شادی ہو گئی۔ چھ ماہ پہلے تقی بھی دبئی چلا گیا ہے۔ چاچی میں بھی اب پہلے والا دم خم نہیں رہا۔ تم نہیں جانتیں اشفا! چاچی نے مرتضیٰ لالا کو کتنا بھڑکایا کہ وہ تم جیسی بدکردار اور عیاش لڑکی کی خاطر زندگی کی خوشیوں سے منہ موڑ رہے ہیں' مگر مرتضیٰ لالا نے ان کی کسی بات کا یقین نہ کیا۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی' مگر عامر نے آواز دے کر بلا لیا۔ اسی رات نمرہ بھی عامر کے ہمراہ چلی گئی تو گھر میں ایک دم تنہائی نے ڈیرے جما لیے۔

ثمینہ چاچی نے اپنا پورشن الگ کر کے بیچ میں دیوار کھڑی کر لی تھی۔ ان کی آمدورفت بھی اس طرف کم کم تھی۔ جب سے اشفا واپس آئی تھی' مہوش نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا۔ وقت اسی رفتار سے گزر رہا تھا۔

انہی دنوں تمام فرائض کی ادائیگی کے بعد تایا ابو نے حج کے لیے درخواست دے دی۔ رب کے گھر سے ان کا بلاوا آگیا اور یوں تائی امی' دادی' پھوپھو اور تایا ابو سب اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے چلے گئے۔ جاتے سے تائی اماں نے اشفا کو ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ وہ کافی دیر اسے گھر کے معاملات کے متعلق سمجھاتی رہیں۔ انہوں نے لاکر کی چابیاں اپنی اکلوتی بہو کے حوالے کر دیں۔

"اشفا پتر! مرتضیٰ تم سے ناراض ہے' میں جانتی ہوں۔ تم اسے منالو وہ ضرور مان جائے گا۔ پہلے تم ہم سے بدگمان تھیں۔ اب مرتضیٰ تم سے بدگمان ہے' یہ غلط فہمیاں کیوں کر بیچ میں آگئیں؟"

"تائی اماں! میں نے اپنی نادانی میں اپنا بہت سا نقصان کر لیا ہے۔" وہ آزردگی سے بولی۔

"ہر نقصان کی تلافی ہو جاتی ہے' مگر کچھ نقصان ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی تلافی ممکن نہیں۔ جو غلطی تم سے سرزد ہوئی ہم نے تمہیں کھلے دل سے معاف کر دیا' مگر بیٹا! مرتضیٰ کو منانا اب تمہارا کام ہے۔ وہ تم سے محبت کرتا ہے' اس کا غصہ وقتی ہے' تم پہل کرو گی تو یقیناً" اس کا غصہ اتر جائے گا۔"

"وہ مجھ سے بھلا کہاں محبت کرتے ہیں؟" اس کی رنجیدگی کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔

"جھلی دھی! عورت تو مرد کی ایک نگاہ سے پہچان لیتی ہے۔"

"آپ کچھ نہیں جانتیں تائی اماں!" اس نے آزردگی سے کہا۔

دادی اور پھوپھو نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں۔ تایا ابا بھی بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ رات ایک بجے کی ان کی فلائٹ تھی۔ جانے سے پہلے انہوں



UrduPhoto.com

نے پھر اسے نصیحتیں کیں تو وہ دل ہی دل میں بولی۔

"تائی اماں! کچھ نصیحتیں بیٹے کو بھی کر دیں۔ اتنی خونخوار نظروں سے گھورتا ہے مجھے۔" ان کے جانے کے بعد وہ اور شازم بالکل تنہا رہ گئے۔ اشفا نے شازم کو زبردستی کھانا کھلا کر سلایا اور خود برآمدے میں آکر بیٹھ گئی۔

یہ وہ ہی گھر تھا' جہاں اسے ہر وقت گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔ مرتضیٰ کے التفات اس کی توجہ کے باوجود وہ ایک لمحہ بھی یہاں نہیں رکنا چاہتی تھی۔ اور اب وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اس کی سوچوں کا محور اب مرتضیٰ کی ذات تھی۔ یہ گھر تھا۔ اسے ہر وقت مرتضیٰ کی یہاں موجودگی کا احساس ہوتا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھی' جب مہوش چلی آئی۔

"تم۔" اشفا کوئی سخت لفظ بولنے سے پہلے لب بھینچ کر خاموش ہو گئی۔

"اشفا! تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"میں تم سے ناراض نہیں' بس شاک کی کیفیت میں ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کرو گی۔" اشفا نے اسے اس کا تحقیر آمیز رویہ یاد دلایا تو وہ سر جھکا کر بولی۔

"میں معذرت کرتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری معذرت سے کچھ لینا دینا نہیں۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ شازم کو میرے پاس بھجوا دو گی' مگر تم نے مجھ سے تمام رابطے توڑ لیے۔" وہ تنفر سے بولی۔

"تم اپنی تمام تر بے عزتی بھلائے واپس کیسے آگئی ہو؟" مہوش نے حیرانی سے پوچھا تو وہ پھٹ پڑی۔

"تم تو چاہتی تھیں کہ میں کبھی نہ آؤں۔ تمہیں کیا پتا مہوش کہ ممتا کیا چیز ہے۔ میں نے اپنی انا' خودداری اور عزت نفس کو اپنی ممتا پر قربان کر دیا ہے۔"

"مرتضیٰ تم سے بے حد متنفر ہے۔ تم نے اس کی انا پر بڑی گہری چوٹ لگائی ہے۔" مہوش نے طنزاً کہا۔

"تم جو چاہتی تھیں وہ تو ہو چکا۔"

"بڑی جلدی سمجھ چکی ہو' مرتضیٰ تو اب تمہاری طرف کبھی بھی نہیں پلٹے گا۔ ویسے بھی عطیہ چاچی نے جس طرح مرتضیٰ کے پیر پکڑ کر اسے تم سے شادی کے لیے منایا تھا' اس حقیقت سے تو تم نگاہ نہیں چرا سکتیں۔ تمہیں تکلیف وہ یہ بات ہے کہ تم ان چاہی ہو۔" مہوش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"بہت گھٹیا سوچ ہے تمہاری۔"

"کیا ادھر تمہارے کسی عاشق نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے' جو واپس لوٹ آئی ہو۔"

"دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔" اشفا نے چلا کر کہا۔

"یہ گھر میرے دادا کا ہے۔" مہوش نے ایک جتانے والی مسکراہٹ لبوں پر سجالی۔ اور بولی "مرتضیٰ کو دوبارہ اپنی طرف راغب کرنے کے لیے تمہیں سر سے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔"

"تمہاری اور مرتضیٰ کی وہ محبت کہاں گئی' جس کی تم نے مجھے داستان سنائی تھی۔" اشفا نے تلخی سے کہا تو وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی۔

"وہ محبت تو آج بھی ہمارے درمیان ہے۔"

"تم نے تو کہا تھا کہ میں اگر چلی جاؤں تو تم مرتضیٰ کو پالو گی۔ پھر ایسا کیوں نہ ہوا۔"

"میں نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔" مہوش قدرے گڑبڑائی۔

"او نہہ۔ اس نے تمہیں خود ہی منہ نہیں لگایا۔" اشفا نے تنفر سے سر جھٹکا اور اٹھ کر اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

تائی اماں کی نصیحتوں کا اثر تھا' اسی لیے مرتضیٰ رات کو ان کی تنہائی کے خیال سے گھر آجاتا تھا' مگر شازم کو سلانے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ اشفا اس کے کٹھور پن پر سلگتی رہتی۔ رات رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کے سر میں اکثر درد رہنے لگا تھا۔

مرتضیٰ نے اسے اذیت دینے کا نیا طریقہ سوچا تھا۔ اس نے گھر کے تمام ملازمین کو چھوٹی کروا دی۔ صرف مکرم جان تھا جس کی مہینے بھر کا راشن لانے کی ذمہ داری



تھی۔ ہفتے بعد وہ ضرورت کی چیزیں لا دیتا۔

اشفا کو سارے کام خود کرنا پڑتے تھے۔ کچن کے کاموں سے تو اس کی جان جاتی تھی' اوپر سے اتنے بڑے گھر کی تنہا صفائی کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اسے غصہ اس وقت آتا جب مرتضیٰ کے مہمان ڈیرے پر آتے اور گھر سے کھانا تیار کر کے بھیجنا پڑتا۔ مرتضیٰ کو بھی اس کے پھوہڑ پن کی اب خبر ہوئی تھی۔

وہ صبح ناشتے کے بعد گھر سے نکلتا تھا اور رات دیر سے اس کی واپسی ہوتی۔ کھانا وہ ہمیشہ گھر آکر ہی کھاتا۔ اور باتیں بنانے کا بھی اسے موقع مل جاتا تھا۔

"کتنی بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت ہو تم۔ کبھی اپنے کمرے کی حالت جا کر دیکھو' اس قدر بے ترتیبی ہے' فرنیچر پر مٹی کی تہیں جم گئی ہیں۔ ابھی تو تین دن نہیں ہوئے اماں کو گئے ہوئے اور گھر کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ شازم کے کپڑے صوفے' قالین اور بیڈ کے اوپر بکھرے پڑے ہیں۔ اور خود وہ اتنا گندا ہو رہا ہے۔ تم نے اسے نہلایا بھی نہیں۔"

"ابھی تو اسے کپڑے پہنائے ہیں۔ صحن میں جا کر گندے کر لیتا ہے۔" بڑے بڑے میلے دھوتی اشفا نے روہانسی آواز میں کہا۔

"صحن میں نہ جانے کب سے جھاڑو نہیں لگا۔ جامن اور آم کے پتوں کا الگ ڈھیر لگا ہے۔" وہ ناگواری سے بولے جا رہا تھا۔

"برتن دھو کر صحن کی صفائی کرتی ہوں۔" اشفا نے مری آواز میں کہا۔

"برآمدہ بھی صاف کرو۔" ایک نیا آرڈر مل چکا تھا۔

وہ جلتی کلستی جھاڑو اٹھا کر صحن صاف کرنے لگی۔ پھر صحن سے اٹھنے والی دھول نے منٹوں میں ہی اسے کارٹون بنا دیا تھا۔ اوپر سے شدید کھانسی نے پل بھر میں ہی اسے بے حال کر دیا۔

"اتنا نہیں ہو سکا' کم از کم صحن میں ٹائلیں ہی لگوا دیں۔" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"مما! بھوک لگی ہے۔ چپس بنا کر دیں۔" شازم نے جالی والے دروازے سے جھانک کر دہائی دی تو وہ نرمی سے بولی۔

"اوکے بیٹا! یہ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"مما! آپ نے پاؤڈر لگایا ہے کیا؟" تھکن سے نڈھال جب وہ کمرے میں آئی تو شازم نے حیرت سے پوچھا۔ اشفا چہرے پر ہاتھ پھیر کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ یہ پاؤڈر اس کی پلکوں اور بالوں میں بھی جذب ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرح ہنستے ہوئے واش روم میں گھس گئی۔

جب باہر آئی تو حالت قدرے بہتر محسوس ہوئی' اس نے مرتضیٰ کو نہ پا کر شازم سے پوچھا۔ "تمہارے بابا بول بول کر سارا زلزلہ گرا کر کہاں چلے گئے ہیں۔"

"بابا کو فلو ہو گیا ہے؟" شازم نے نا سمجھنے والے انداز میں پوچھا' تو اشفا مسکرائی اور بولی۔ "آؤ میں اپنے بیٹے کو چپس بنا کر دوں۔"

"اوکے۔" وہ اس کے ساتھ ہی کچن میں آگیا۔ اشفا نے آلو کاٹ کر کڑاہی میں تیل ڈالا۔ بیس منٹ بعد چپس تیار تھے۔ ایک پیالی میں اس نے کیچپ ڈالی اور گلاس میں پیپسی اور برف کے کیوبز ڈال کر وہ مختصر سا لنچ شازم کے سامنے رکھے خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

"مما! آپ بس چپس اچھے بناتی ہیں۔"

"اور کوئی بھی چیز آپ کو مما کے ہاتھ کی پسند نہیں آتی۔"

"نا میں۔" اس نے سچائی سے جواب دیا تو اشفا نے مصنوعی خفگی سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"مما ٹرائفل تو اچھا بناتی ہیں۔"

"ہاں' اور باقی سب گندا ہے۔" وہ مزے سے پیپسی کے سپ لے رہا تھا۔ اشفا نے منہ بنا لیا اور بولی۔

"ہونا کٹھور باپ کے کٹھور بیٹے' اتنی محنت کرتی ہوں اور تم باپ' بیٹے کو کچھ پسند ہی نہیں آتا۔ اتنے نخرے ہیں تم دونوں کے۔"

"دادو سب اچھا بناتی ہیں۔ اور پھوپھو بھی۔" وہ پرسوچ انداز میں بولا۔ دروازے سے اندر آتے مرتضیٰ نے ان ماں' بیٹے کی کچھ تکرار سن لی تھی' تاہم وہ تاثر



UrduPhoto.com

دیئے بغیر بولا۔

"کھانا تیار ہے تو دو۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

اشفا سرعت سے اٹھی اور رات کا بچا ہوا سالن اور روٹی بنا کر اس کے سامنے رکھی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ چکن کا سالن ہے۔ وہ اصل میں غلطی سے میں نے چکن کو پریشر ککر میں ڈال دیا تھا' تو یہ ہڈیاں الگ ہو گئی ہیں اور گوشت الگ۔"

"یہ تو بہت ہی فخریہ کارنامہ سرانجام دیا ہے آپ نے۔" مرتضیٰ نے بے دلی سے کھانا شروع کیا۔

"اتنا بھی مل جاتا ہے اسی پر اکتفا کریں۔"

"ہاں' تم سے کچھ بعید نہیں کہ فاقے ہی کروانے شروع کر دیتیں۔"

"خود ہی تو کہہ رہے تھے آپ کہ میں روزانہ آلو بناتی ہوں۔ اب رات کو چکن بنایا ہے تو آپ گھر نہیں آئے اور سامنے رکھا ہے تو باتیں بنا رہے ہیں۔" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی۔

"شازم! اس چکن کی تم ہی تعریف کر سکتے ہو۔ آخر آل یہ تمہاری ماں ہے۔ اور تمہیں یہ پیاری بھی بہت ہے۔" مرتضیٰ نے پیپسی کے خالی گلاس میں چپس ڈالتے شازم کو مخاطب کیا۔ اشفا تو صرف اسی بات پر ہی کھل اٹھی تھی کہ مرتضیٰ نے اسے طلب کیا ہے۔ آئندہ آنے والے دنوں میں بھی وہ ضرورت کے وقت اسے آواز دے لیتا تھا' مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مرتضیٰ نے سچ مچ اسے اپنی "ضرورت" ہی سمجھ لیا ہے۔ وہ اشفا جس سے اسے محبت تھی' وہ کہیں کھو گئی تھی۔ اب وہ صرف شازم کی ماں اور مرتضیٰ کی "ضرورت" تھی۔

اس نے بہت واضح لفظوں میں اشفا کو اس کی "اوقات" یاد دلا دی تھی۔ اشفا کو نظر سے گری اور دل سے اتری عورت کے مفہوم کی بھی اب سمجھ آئی تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ تایا ابا نے ایک مرتبہ پھر مرتضیٰ کو اشفا کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لیے مجبور کر لیا تھا۔ تائی اماں اور تایا ابا کے آنسوؤں نے یقیناً

اسے پھر سے زیر کر دیا تھا۔

اس کی ایک غلطی تمام عمر کے لیے پشیمانی بن چکی تھی۔ اسے اس رات بہت رونا آیا' جب مرتضیٰ نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔

"رات کی تاریکی میں گھر سے بھاگنے والی عورتوں کی تم نہیں جانتیں کیا سزا ہے۔ مگر میں نے شازم اور بابا کی خاطر تمہاری اس سزا کو معاف کیا' مگر تم ساری زندگی بھی میرے دل میں اپنا وہ مقام و احترام بحال نہیں کر پاؤ گی' جو کبھی میرے دل میں تمہارے لیے موجود تھا۔ اب لائٹ آف کر کے ادھر آ جاؤ۔"

اشفا نے مشکل سے ہی سہی اس تلخ حقیقت کو پی لیا۔ اگر وہ اسے اپنی ان تمام بدگمانیوں' غلط فہمیوں اور مہوش کی چال بازی کے متعلق بتا بھی دیتی تو جو جرم اس سے سرزد ہو گیا تھا اس کی تلافی کیسے ممکن ہوتی۔

وہ رات کی تاریکی میں ایک حاسد عورت کی باتوں میں اور وقتی غصے کی لپیٹ میں آ کر نکل گئی۔ اگر اسے ان نزاکتوں کا پتا ہوتا تو وہ کبھی بھی ایسا نہ کرتی۔ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اور جس معاشرے اور ملک کی وہ رہنے والی تھی' وہاں یہ باتیں معمول کا حصہ تھیں۔

کبھی اولاد ماں' باپ سے جھگڑ کر گھر چھوڑ دیتی۔

کبھی ماں' باپ آپس میں جھگڑ کر اولاد کو چھوڑ دیتے۔

کبھی بیوی شوہر سے ناراض ہو کر بھاگ جاتی۔

کبھی شوہر بیوی سے تنگ آ کر غائب ہو جاتا۔

یہ تو اس کی ماں کی تربیت کا اثر تھا جو وہ ہمیشہ باوفا اور ثابت قدم رہی۔ کیا اس کا شوہر کبھی اس کی بات یقین کرے گا کہ وہ شخص ہی اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے۔ جس سے اس نے محبت کی۔

مرتضیٰ کے سرد رویے کی وجہ سے وہ ہر وقت افسردہ سی رہنے لگی تھی۔ اگرچہ روزانہ ہی ثانیہ اور نمو سے فون پر بات ہوتی تھی اور کئی مرتبہ تو تایا ابا سے بھی مرتضیٰ نے بھی کروا دی تھی' مگر پھر بھی وہ سب گھر والوں کو بہت مس کر رہی تھی۔ اس کے بار بار کے اصرار پر ثانیہ نے آنے کی ہامی بھر لی۔ ہفتے کی شام



عاشر اپنے دونوں بیٹوں کو اور ثانیہ کو چھوڑ گیا تھا' جاتے جاتے اس نے کتنی ہی مرتبہ دہائی دی تھی۔

"دل پر پتھر رکھ کے چھوڑ کے جا رہا ہوں' صرف اور صرف آپ کی خاطر بھابھی۔"

"اس احسان عظیم کا شکریہ۔" اشفا اس کے مسخرے پن پر مسکراتی رہی' کہیں سے بھی تو دو بچوں کا باپ نہیں لگ رہا تھا۔

ثانیہ کے آ جانے سے گھر میں خوب رونق ہو گئی تھی۔ بچوں کے ساتھ شازم کا بھی خوب دل لگ گیا۔ سارا سارا دن وہ تینوں آپس میں کھیلتے رہتے۔ شازم اب ضد بھی نہیں کرتا تھا۔ رات کو جب اشفا اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو اس نے بڑے آرام سے پورا گلاس خالی کر دیا۔

"مما! ایک بات بولوں۔"

"جان مما! ایک نہیں ڈھیر ساری باتیں بولو۔" اشفا نے اس کے سرخ رخسار چوم کر کہا۔

"مما! شازم اکیلا کیوں ہے؟"

"شازم اکیلا کیسے ہے۔ شازم کے پاس مما ہیں بابا ہیں۔" اشفا قدرے چونک سی گئی تھی۔

"نائیں۔۔۔" اس نے غصے سے سر دائیں بائیں ہلایا۔ "شازم کو بے بی چاہیے نومی جیسا۔"

"شازم۔۔۔" اشفا کو ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا۔ اندر آتے مرتضیٰ نے بھی ٹھٹک کر منہ بسورتے اپنے لاڈلے کی طرف دیکھا۔ جس کی فرمائشیں دن بہ دن مشکل سے مشکل ترین ہوتی جا رہی تھیں۔

"مما! شازم کس کے ساتھ کھیلے۔" وہ ٹھنکا۔

"اتنے تو کھلونے ہیں آپ کے' بابا کے ساتھ جا کر اور لے آنا۔" اشفا نے مرتضیٰ کو دیکھ کر اسے بہلانا چاہا۔

"شازم کو کھلونے نہیں لینے' بے بی لینا ہے۔"

"او کے' میری جان بے بی بھی لا دیں گے۔" مرتضیٰ نے اسے گود میں اٹھا کر بھینچ لیا تو اس کا چہرہ مارے خفت کے سرخ پڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

"لالا! جب تک اماں اور بابا نہیں آتے' آپ ہمیں اور بچوں کو کہیں گھما' پھرا لائیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ مری چلتے ہیں۔" ثانیہ نے بڑے دلار سے فرمائش کی تھی۔ مرتضیٰ نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلا دیا۔

ثانیہ نے نمو اور عامر سے بھی بات کی تھی' مگر عامر کو چھٹی نہ مل سکی' البتہ عاشر اسی شام آ گیا تھا۔

اگلی صبح بہت سویرے انہیں گھر سے نکلنا تھا۔ اشفا اور ثانیہ نے مل کر تمام تیاری مکمل کر لی تھی۔ بچے بے حد خوش تھے' اسی خوشی کے عالم میں کچی نیند سے اٹھائے جانے پر بھی نہ روئے۔ پہلا قیام ان کا اسلام آباد میں تھا۔ تقریباً" تین دن وہ اسلام آباد ٹھہرے تھے۔ دامن کوہ' فیصل مسجد' راول ڈیم اور مرتضیٰ کے کزن کی فیملی سے ملنے کے بعد وہ مری کی طرف عازم سفر ہو گئے تھے۔

مری کے ایک قدرے مناسب ہوٹل میں مرتضیٰ نے پہلے سے ہی بکنگ کروالی تھی۔ شازم' حنان اور نومی بے حد مسرور تھے۔ بھوربن اور نتھیا گلی سے ہوتے ہوئے مال روڈ اور پھر عاشر کے اصرار پر وہ گھر واپسی کے بجائے کاغان کی طرف نکل گئے۔

یہاں کے فلک بوس پہاڑ' سرسبز وادیاں' گیت گاتی' شور مچاتی' گنگناتی ندیاں' طویل و عریض سبزہ زار' خوشنما جھیلیں' تیز و تند جلالی دریا' فطرت کے دیوانوں اور شیدائیوں کے لیے ایک بہت بڑا اثاثہ اور قدرت کا انمول اور بیش بہا تحفہ ہے۔

اشفا نے پورے سفر کے دوران ایک بات نوٹ کی تھی کہ ثانیہ اور عاشر کے درمیان کسی قدر بے تکلفی تھی۔ پورے سفر میں عاشر کی چھیڑ چھاڑ اور ثانیہ کا شرمانا' مسکرانا کس قدر اپنائیت و محبت تھی دونوں کے درمیان۔

کاغان میں ان دنوں بہت رش تھا۔ ملکی اور غیر ملکی سیاح اور فطری حسن کے دیوانے نہ جانے کہاں کہاں سے ان دلکش نظاروں کو دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

دوران سفر ہی بچے اور وہ دونوں خواتین تھک چکی تھیں' لہٰذا ہوٹل پہنچتے ہی شازم سونے کے لیے مچلنے



UrduPhoto.com

لگا۔ ثانیہ بھی بچوں کو سلانے اور خود آرام کی غرض سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ سامان رکھنے کے بعد عاشر اور مرتضیٰ دونوں کہیں نکل گئے تھے۔ البتہ وہ اور شازم دونوں ہی بہت دیر تک سوتے رہے۔

اشفا کی آنکھ مرتضیٰ کے جھنجوڑنے پر کھلی تھی۔ وہ انتہائی غصیلے تاثرات لیے اسے گھور رہا تھا۔

"میرے کپڑے کہاں ہیں؟"

"وہ بلیک سوٹ کیس میں ہیں۔"

"اس میں تو تم نے جرسیاں' سوئیٹر اور شالیں بھری ہیں۔ بے وقوف' احمق عورت کیا یہ گرم کپڑے پہننے کا موسم ہے۔"

"میں سمجھی مری میں ٹھنڈ ہو گی۔" وہ اپنی شرمندگی چھپانے کی غرض سے کمبل میں منہ چھپانے لگی تو مرتضیٰ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر سے کمبل کھینچا۔

"اگر کسی سے مشورہ لے لیا جائے تو بے وقت کی شرمندگی اور خجالت سے بچا جا سکتا ہے۔" وہ بہت کچھ جتا کر پلٹا تو اشفا پیچھے سے بولی۔

"آپ کے کپڑے شاید لیدر کے بیگ میں ہیں۔ آپ رکیں میں نکال دیتی ہوں۔"

"شکریہ' آپ زحمت نہ کریں اور ہاں شازم کو جگاؤ' کچھ کھا پی لے۔ اور اب پوستیوں کی طرح دوبارہ مت سو جانا۔ خوامخواہ میرا اتنا خرچہ بھی کروایا ہے۔ اگر سونا ہی تھا تو گھر میں ہی رہ لیتیں۔"

"توبہ میری تین' چار گھنٹوں کی نیند پر کیسے مشتعل ہو رہے ہیں' میرا سونا تو انہیں کسی بھی صورت گوارا نہیں۔ اتنی باتیں سنا دی ہیں۔" مرتضیٰ کے جانے کے بعد وہ جلتی کلستی اٹھ بیٹھی۔ شازم کو جگا کر ہاتھ منہ دھلوایا' کپڑے پہنائے' کچھ ہی دیر بعد ثانیہ بھی بچوں کو تیار کر کے لے آئی تھی۔ چائے پینے کے بعد وہ دونوں بھی بچوں سمیت نیچے آ گئیں۔

مرتضیٰ اور عاشر انہی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انہیں آتا دیکھ کر مرتضیٰ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چونکہ رات کافی ہو چکی تھی اور پیٹ میں بھی چوہوں کا میچ شروع تھا' لہٰذا پہلے پیٹ پوجا کرنے کا سوچا۔

عاشر نے اپنی فیورٹ ڈشز یعنی کہ سنگھاڑا مچھلی اور پہاڑی مرچ کلاں اور قیمے کے سالن کا آرڈر دیا۔

ثانیہ اور اس کے لالا کی پسند ایک سی تھی۔ انہوں نے کابلی چنے کا پلاؤ اور تندوری مرغی منگوائی' جبکہ اشفا نے ان تینوں کی پسند سے ہی پیٹ بھرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"اف سالن میں کس قدر مرچیں ہیں۔" ثانیہ نے سوں سوں کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"توبہ' یہ سالن منگوانے کی کیا ضرورت تھی۔" ثانیہ نے ناک چڑھائی۔

"تم اپنے کابلی چنے کا پلاؤ کھاؤ' میرے مرچوں والے سالن کو نظر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" عاشر نے جذباتی پن سے ڈونگا ثانیہ کے سامنے اٹھا لیا۔

عاشر اور ثانیہ کی مزے دار نوک جھوک کے دوران کھانے سے بھرپور انصاف کیا گیا تھا۔ اگلے تین دن مرتضیٰ اور عاشر نے انہیں کاغان کا چپا چپا دکھا ڈالا اور حد سے زیادہ تھکایا۔ ان تین دنوں میں وہ صرف رات کو ہی سوتی تھیں اور سارا دن بچوں سمیت ان دونوں کے احکامات پر عمل کرتیں۔

"میرو تفریح کا شوق پورا ہوا ہے کہ نہیں۔" مرتضیٰ' ثانیہ کو مسلسل چھیڑ رہا تھا۔ ایک ہفتہ کاغان میں رہنے کے بعد اب وہ مزید نہیں اور جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ لہٰذا ان پر ترس کھا کر مرتضیٰ نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ جس رات وہ لوگ گھر پہنچے' اسی رات تین بجے فون کی بیل گونج اٹھی۔ فون مرتضیٰ نے ہی سنا تھا۔ اور کاش کہ وہ کبھی یہ فون سنتا ہی نہیں۔ یہ فون ان کے لیے قیامت کی خبر لایا تھا۔

مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے تایا ابا اور ان کا پورا گروپ جس بس میں سوار تھا وہ بس حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ ان کے گھر کے چاروں بزرگوں نے مدینہ طیبہ میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لیں۔ اور مدینہ طیبہ کی مٹی ان کا نصیب ٹھہری۔ وہ خوش قسمت تھے



جنہیں اللہ نے اپنے نگر بلایا اور پھر تاقیامت اپنے گھر میں ہی ان کا مدفن بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان چاروں عاشقوں کی نہ جانے کون سی ادا پسند آئی تھی کہ ان سب کی ہی دلی خواہش کو پورا فرما دیا۔

اسے دادی کی وہ دعائیں یاد آئیں۔ جو وہ ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے مانگا کرتی تھیں۔

"مولا! اپنے گھر بلانا' اپنے در پر بلانا اور پھر واپس کبھی نہ آنے دینا۔"

ان سب کے لیے یہ صدمہ بہت عظیم تھا۔ اشفا تو پہلے ہی اپنے والدین کی دائمی جدائی کا دکھ دیکھ چکی تھی' سوان سب کو حوصلہ دیتے۔ سنبھالتے ہوئے کبھی کبھی اس کے اپنے حوصلے بھی بکھر جاتے۔ مرتضیٰ خود بکھرا ہوا تھا' بہنوں کو کیا حوصلہ دیتا۔ عامر اور عاشر کی اپنی حالت بہت بری تھی۔ ان کے لیے تو ماں ہی سب کچھ تھی۔ انہیں ماں نے ہی سب رشتوں کا پیار دیا تھا' اسی لیے تو انہیں کبھی باپ کی یاد نہیں آئی تھی۔ سائرہ اور ثمن بھی غم سے نڈھال تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو کیا دلاسا دیتے۔

سب سے بڑا صدمہ تو یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیاروں کا آخری دیدار بھی نہیں کیا۔ دنیاداری کے تقاضوں کے تحت انہوں نے وہ تمام رسومات پوری کیں جو کہ اس معاشرے کا حصہ بن چکی تھیں۔ چالیسویں تک لوگ افسوس کرتے اور تعزیت کے لیے آتے رہے۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی آمد و رفت بھی کم ہو گئی تھی۔

ابھی یہ صدمہ تازہ ہی تھا کہ نقی اور تقی نے زمین میں اپنا حصہ الگ کرنے کا شوشا چھوڑ دیا۔ ان دونوں کو مرتضیٰ کی تکلیف کا احساس بھی کیسے ہوتا۔ شروع سے ہی چاچی نے بچوں کے ذہنوں کو ان کے خلاف بھڑکا کر آلودہ کر دیا تھا۔ اور مرتضیٰ تو چاچی سے اس دن سے متنفر تھا جب وہ اس گھر میں آئی تھیں۔ ہر وقت اماں کے کان میں بھی مرتضیٰ کے خلاف انہیں اکساتی رہتیں۔

"آپا! بھلا سوتیلی مائیں بھی اتنا خیال رکھتی ہیں۔ آپ نے تو اس فتنے کو سر چڑھا رکھا ہے۔" یا پھر کہتیں "کیا ضرورت ہے اسے اچھے اسکولوں میں پڑھانے کی' خوامخواہ اتنا خرچہ۔"

وہ نہ مرتضیٰ کو اچھی لگتی تھی نہ انہیں مرتضیٰ سے کوئی دلچسپی تھی۔ یہ دشمنی اس کی نوجوانی کی عمر تک جاری رہی اور پھر خود بخود چاچی کا رویہ اس سے بہتر ہوتا چلا گیا۔ مرتضیٰ نے عاشر اور عامر سے مشورہ کر کے جو ان کا جائز حق تھا انہیں دے دیا' مگر اس کے باوجود بھی انہوں نے اس پر مقدمہ دائر کروا دیا تھا۔ وہ مزید زمین اس سے مانگ رہے تھے' جسے دینے کے لیے مرتضیٰ نے انکار کر دیا۔

"جو قانونی حق ان کا بنتا تھا وہ میں دے چکا ہوں۔ مزید ایک ٹکڑا زمین کا نہیں دوں گا۔" ثانیہ اور نمرہ جھگڑا بڑھ جانے کے خوف سے بھائی کو رضامند کر رہی تھیں کہ وہ لوگ جو مانگتے ہیں دے دو' مگر مرتضیٰ کسی طور نہیں مان رہا تھا۔

"اگر آپ زمین نہیں دینا چاہتے تو نہ دیں' بدلے میں رقم دے دیں۔ میرے پاس پچاس ساٹھ لاکھ کی رقم ہے۔"

"شٹ اپ اشفا!" مرتضیٰ اس زور سے دھاڑا کہ وہ تینوں ہی سہم گئیں۔

"تمہیں ان معاملات میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا مسئلہ ہے میں نبٹا لوں گا۔"

"لالا! آپ کو پتا تو ہے کہ وہ شروع سے ہی لالچی ہیں۔ آپ ان لالچیوں کے متھے زمین مار دیں۔" ثانیہ سمجھانے والے انداز میں بولی تو مرتضیٰ غصے سے اٹھ کر چلا گیا۔

نمرہ اور ثانیہ پچھلے دو ماہ سے ادھر ہی تھیں۔ آج ان دونوں کو ہی جانا تھا۔ ثانیہ' لالا کی وجہ سے فکرمند تھی۔ اور نمرہ کو کچھ اور بھی فکریں کھائی جا رہی تھیں۔ جاتے ہوئے اس کے کان میں رازداری سے بولی۔

"اب شازم کے بہن یا بھائی کو آ جانا چاہیے۔"

"ہاں' تو اور کیا۔" ثانیہ نے بھی تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ "تمہاری دعائیں جلد قبول ہوں گی۔" ان



UrduPhoto.com

دونوں کے جانے کے بعد زندگی پھر سے اپنی ڈگر پر آگئی تھی۔ پہلے اسے یہ انتظار تو تھا کہ بہت جلد دادی، تایا ابا آنے والے ہیں وہ دن گن گن کر گزار رہی تھی، مگر اب وہ کس کا انتظار کرتی۔

اب اس نے گھر کو بھی اچھی طرح سنبھالنا سیکھ لیا تھا۔ دن ویسے ہی بے رنگ اور پھیکے سے گزر رہے تھے۔ شازم کے ساتھ دن اچھا مصروف سا گزر جاتا تھا، مگر جب وہ سو جاتا تو پھر اشفا پورے گھر میں بولائی بولائی پھرتی۔ کبھی کبھی وہ حیرت سے سوچتی تھی کہ کیا میں وہی اشفا ہارون ہوں۔

وہ نخرے، وہ ضدیں، لاڈ، غصہ تلملاہٹیں، خفگیاں، سب اک خواب سا محسوس ہوتا تھا۔

مرتضیٰ کا رویہ ویسا ہی تھا کبھی دھوپ، کبھی چھاؤں۔ وہ اس امید پر ہر دن اور ہر رات مطمئن سی رہتی کہ کبھی تو مرتضیٰ اس کی چار سال پہلے سرزد ہو جانے والی اس غلطی کو معاف کردے گا۔

عاشر اور عامر کے اصرار بلکہ ضد پر اس نے نقی اور تقی کو مزید زمین دے دی تھی۔ اور پھر خود اس نے تھوڑی سی زمین بیچ کر لاہور کے قدرے پوش علاقے میں چھوٹا سا مگر خوبصورت گھر لے لیا۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ شہر میں شفٹ ہو گئے تھے اور یہی اتنے عرصے بعد ایک واحد تبدیلی تھی، جس نے اس کے بیٹے اور خود اشفا کے مزاج پر خوشگوار اثر ڈالا۔

اگرچہ مرتضیٰ روزانہ ہی گاؤں کا چکر لگاتا تھا، اکثر رات بھی وہیں رک جاتا۔ زمینوں کا سارا حساب کتاب اب مکرم جان کے سپرد تھا۔

وہ اپنے گاؤں سے تعلق نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ اس گاؤں سے اس مٹی سے تو اسے عشق تھا۔ ان لوگوں سے اس کا ایک تعلق تھا، وہ کیونکر ان سے منہ موڑتا۔

یہاں آنے کے بعد ایک اور خوشگوار تبدیلی بلکہ خوشخبری انہیں ملی، جس نے ان سب کے غمزدہ دلوں کو پھر سے سرشار کردیا تھا۔

ثانیہ اور نمرہ بہت خوش تھیں۔ خوش تو اشفا بھی بہت تھی۔ بس ایک مرتضیٰ ہی تھا جس کے تاثرات سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اسی طرح وقت کے تھال میں مزید کچھ مہینے اور آن گرے۔

☼ ☼ ☼

وہ جب بھی گاؤں آتا تھا، اپنے گھر میں ہی ٹھہرتا۔ آج بھی وہ کافی دیر زمینوں کا چکر لگانے کے بعد گھر آیا تو برابر والے مکان سے بڑی درد بھری آواز سنائی دی۔

اے راجہ حسن دا صدا راج مانے
کدی پھیرا پاول غریباں دے ڈیرے

"ہیں یہ پڑوس میں کون سی مائی میراں آگئی۔"

وہ سوچتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

سارے گھر کی تمام لائٹس آن کرکے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ چونکہ سارا دن مصروف گزرا تھا، لہٰذا کافی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ جب وہ بہت تھک جاتا تو پھر نیند بہت مشکل سے آتی۔

وہ جوں ہی بستر پر دراز ہوا تو اماں اور بابا کی یاد آنکھوں کو نم کرنے لگی۔ اس گھر میں کبھی خوب رونق ہوا کرتی تھی۔ قہقہے، مسکراہٹیں، خوشیاں، پھر آہستہ آہستہ اس گھر میں غموں نے بسیرا کرلیا۔ ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔

نہ جانے کیوں آج پھر زخموں سے گویا ٹانکے ادھڑ رہے تھے۔ بیتا وقت یاد آرہا تھا۔ زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ یادیں جو ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ کچھ خوشیاں، بہت سے غم۔

اماں اور بابا کی جدائی نے اسے اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ کسی کم سن بچے کی طرح خوب دھاڑیں مار مار کر روئے۔

اس کی پیاری ماں جو سوتیلی ہونے کے باوجود اس کے لیے صرف "ماں" ہی تھی۔ اگرچہ اماں کی بہن اس کی چاچی انہیں کس قدر اس سے متنفر کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی تھیں۔ مگر اماں کے رویے میں کبھی اک پل کے لیے بھی تبدیلی نہیں آئی۔ حتیٰ کہ نمرہ اور ثانیہ کی آمد کے بعد بھی جو اہمیت اس کی تھی اور جو اسے محبت ملتی تھی وہ ہمیشہ اسی کی رہی۔

وہ ہاسٹل سے گھر آتا، اماں اس کے لیے ڈھیروں مزے دار پکوان اپنے ہاتھ سے بنواتیں اور پھر منتیں کر کرکے کھلاتیں۔

اتنے ڈھیروں کے حساب سے لاڈ پیار کے باوجود وہ بگڑا نہیں تھا، بلکہ اماں اور بابا کی محبتوں نے اسے ڈھیروں اعتماد بخشا۔

وہ جب بھی گھر آتا ثمینہ چاچی کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ نو، دس سال کے بچے سے نہ جانے ان کا کیا بیر تھا یا پھر یہ ان کی فطرت میں شامل تھا۔ ہر ایک سے تلخ کلامی کرنا، طنز کے تیر برسانا۔ غصے سے گھورتے رہنا۔ اور مرتضیٰ کو تو کبھی کبھی وہ مار پیٹ بھی لیتی تھیں، مختلف بہانوں سے۔ وہ نوجوانی کی عمر کو پہنچا تو چاچی کے رویے میں خود بخود تبدیلی آگئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسے ذہانت اور وجاہت سے بہت نوازا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کا اچھا اور دل موہ لینے والا اخلاق تھا جو بھی اس سے ملتا گرویدہ ہی ہو جاتا۔

یاد تھا پہلی مرتبہ کب، کس دن اور کس موقع پر مرتضیٰ اور چاچی کی براہ راست تلخ کلامی ہوئی تھی۔

وہ معمول کے مطابق یونیورسٹی سے گھر آیا تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ ٹریکٹر لے کر زمینوں کی طرف نکل گیا۔ رات جب وہ گھر واپس آیا تو مہوش آئی بیٹھی تھی۔ مرتضیٰ کو زیادہ بولنا اور خصوصاً" چاچی کی فیملی کے ساتھ بولنا قطعاً" ناپسند تھا۔

یہ اسی رات کی بات ہے جب مہوش اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئی۔ مرتضیٰ اپنی ناگواری چھپائے مہوش کی طرف متوجہ ہوا۔

"کوئی کام تھا تو باہر ہی کہہ لیتیں۔"

"سب کے سامنے کہنے والا "کام" نہیں ہے۔" وہ معنی خیزی سے مسکرائی۔

"بولو، کیا کہنا ہے۔"

"اظہار محبت کرنا تھا۔" مہوش نہایت بے خوفی سے بولی تو وہ چیخ پڑا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔" اس کی ڈھٹائی، عروج پر تھی۔ پھر اس نے ایک لو لیٹر اس کی طرف بڑھایا۔ مرتضیٰ نے وہ کاغذ کا ٹکڑا نہیں پکڑا تھا۔ مہوش وہ خط کرسی پر رکھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مرتضیٰ نے وہ خط اٹھا کر پڑھا تو اس کا رواں رواں سلگ اٹھا۔ وہ غصے سے بھناتا ہوا چاچی کے پورشن میں پہنچ گیا۔ مگر چاچی نے الٹا آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ انہوں نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اور رو رو کر دہائیاں دیں۔

"میری معصوم بیٹی کو اس نے ورغلایا ہے۔"

"ثمینہ! ہوش کر، بغیر سوچے سمجھے میرے بچے پر الزام لگانے کی ضرورت نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ ایسا ہرگز نہیں۔" اماں اور دادی دونوں نے ثمینہ کو جلی کٹی سنائیں تو انہوں نے مزید واویلا کرنا شروع کردیا۔

"ہمیں اپنی تربیت پر فخر ہے۔ میرا میر پتر آج کل کے چھچھورے لڑکوں کی طرح نہیں۔ اور پورا خاندان جانتا ہے کہ ہارون کی بیٹی میرے میر پتر کی بچپن کی منگ ہے۔" دادی نے گرج کر کہا تو ثمینہ جل بھن گئیں اور مہوش ساکت سی رہ گئی۔

اس واقعے کے بعد مرتضیٰ نے ثمینہ چاچی کو مخاطب کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مگر مہوش نے اپنی گھٹیا حرکتوں کو ترک نہیں کیا تھا۔

وہ جب بھی گھر آتا مہوش پہلے سے موجود ہوتی۔ شعر و شاعری والے کارڈ، خطوط اور گفٹس جو کہ وہ چپکے سے مرتضیٰ کے کمرے میں رکھ آتی تھی، پھر انہیں اکٹھا کرکے اس کے منہ پر مارنا مرتضیٰ کا کام تھا۔

کچھ وقت مزید بیتا اور اماں اور دادی نے ہارون چچا سے شادی کا تقاضا کرنا شروع کردیا۔

اشفا ہارون جو کہ اس کی بچپن کی منگیتر تھی، نہ جانے کب، کیسے اور کیونکر اس کے خیالوں پر چھاتی چلی گئی۔ مرتضیٰ نے بہت بچپن میں اسے دیکھا تھا۔ اسے تو اب اشفا کے نقوش تک بھول چکے تھے۔ مگر اس کا خیالی پیکر ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ وہ اسے چپکے چپکے چاہنے لگا تھا۔ جب بھی اماں اور دادی اس کا ذکر چھیڑتیں، مرتضیٰ کے دل کے تار بج اٹھتے۔

پھر ہارون چچا نے پاکستان آنے کا بتا کر ان سب کو مسرور کردیا تھا۔ وہ شادی کے سلسلے میں ہی آنا چاہتے تھے۔

مرتضیٰ نے یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اشفا اس کے ساتھ شادی پر دل سے راضی نہیں ہوگی۔ وہ تو مطمئن تھا۔ سرشار تھا۔ مسرور تھا۔ عطیہ چاچی بار بار اشفا کو خوش رکھنے کا اس سے وعدہ لے رہی تھیں۔

"دیکھو مرتضیٰ! ہمارے بعد ہماری بیٹی کا تم نے بہت خیال رکھنا ہے۔ اسے کبھی تکلیف مت دینا۔ وہ کچھ ضدی اور ناسمجھ ہے اور ہم سے کچھ کچھ ناراض بھی۔ مگر تم اسے کسی بھی حال میں خود سے الگ نہ کرنا۔" مرتضیٰ نے انہیں ہر طرح سے مطمئن کردیا۔ مگر خود وہ اشفا کے رویوں پر کئی مرتبہ الجھا تھا۔ اسے غصہ بھی بے تحاشا آتا، مگر خود پر کنٹرول کرکے اشفا کی تمام تلخ و کڑوی باتوں کو شہد کا گھونٹ سمجھ کر پی جاتا۔

اس نے اشفا کی ہر خطا کو معاف کرنے کا پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا، مگر ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے ضبط کے طنابیں چھوٹ گئیں۔ اس کا مان ریزہ ریزہ ہوگیا۔ وہ بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی انا کا بت بھی پاش پاش ہوگیا۔ اس کی ہستی کا غرور خاک میں مل گیا۔ دل لہولہو ہوگیا، اس کی بے تحاشا محبت، دیوانگی اس کا منہ چڑاتی رہ گئی۔

اسے یوں محسوس ہوا کہ میر مرتضیٰ اندر سے مرگیا ہے۔ وہ اس رات واقعی مرگیا تھا، جب مہوش جیت کے نشے سے سرشار آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک لیے اس کے کمرے میں بڑے تفاخر سے داخل ہوئی تھی۔

"چلی گئی، تمہاری اشفا چلی گئی۔ کتنے مزے کی بات ہے، میر مرتضیٰ کی بیوی اپنے دو ماہ کے بچے کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ نہ جانے کس کے ساتھ، کوئی پرانا عاشق ہوائے فرینڈ۔۔۔ ہاہاہا۔" وہ قہقہے لگا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔

"کہاں منہ چھپاؤ گے مرتضیٰ! کتنی بے عزتی کی بات ہے کہ تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ گئی، بلکہ تم پر تھوک گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ لڑکی زیادہ دیر تمہارے ساتھ نہیں رہ پائے گی۔ ان عیاش، آوارہ امیر زادیوں کا بھلا کیا بھروسہ، مگر تم پر تو اس کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ واہ مزا آگیا ہے۔ اسی دن کے لیے تو میں بے قرار تھی، بے چین تھی۔ اب میری روح بھی پرسکون ہوگئی ہے۔" وہ اسے پتھر کا بت بنا چھوڑ کر چلی گئی۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ مرتضیٰ حیدر نے ہنسنا چھوڑ دیا ہے۔ ہنستا تو وہ پہلے بھی کبھی کبھی نہیں تھا، مگر لوگ کہتے تھے کہ وہ نہ بھی مسکرائے تو اس کی آنکھیں مسکراتی ہیں۔

اس نے خود کو شازم کے وجود میں گم کرلیا۔ اس نے لوگوں کے طعنوں اور طنز بھری گفتگو سے بچنے کی خاطر ہر کسی سے ملنا چھوڑ دیا۔

اس نے محفلوں میں بیٹھنا ترک کردیا۔

اسے ہجوم سے نفرت سی ہوگئی تھی۔

اسے زندگی سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔

اور اسے "عورت" سے بھی نفرت ہوگئی تھی۔

اسی لیے تو جب چاچی نے بابا کے پیر آکر پکڑے کہ وہ مرتضیٰ سے مہوش کی شادی کردیں تو انہوں نے سختی سے انکار کردیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے مزاج کے ہر رنگ سے واقف تھے۔ پھر مہوش بھی بہت روتی گڑگڑاتی رہی تھی، مگر مرتضیٰ تو واقعی پتھر ہوچکا تھا۔

تنگ آکر چاچی نے زبردستی مہوش کی شادی کردی۔ وقت بیتتا گیا۔ موسم بدلتے رہے خزائیں اور بہاریں آتی جاتی رہیں اور پھر ایک روز وہ پھر سے پورے چھ سال بعد اس کا ضبط آزمانے کے لیے چلی آئی تھی۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اشفا کے حسین چہرے کو مسخ کردے، اسے جان سے مار دے، مگر ایک مرتبہ پھر بابا نے اسے اپنی محبتوں کا واسطہ دے کر روک دیا۔ انہوں نے پھر سے اسے پابند کردیا۔

"اگر تو نے میری اشفا کے ساتھ زیادتی کی، اسے تکلیف پہنچائی یا کبھی چھوڑنے کی کوشش کی تو مرتضیٰ



تیرے بابا کو قبر میں بھی چین نہیں آئے گا۔ میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

وہ بے بس ہوگیا تھا۔ مجبور ہوگیا اور پھر شازم کی ماں سے محبت کو دیکھ کر اسے دل پر صبر کرنا پڑا تھا۔

دستک کی آواز سن کر اس کی سوچوں کو بریک لگے تھے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر دروازہ کھولنے گیا تو سامنے مکرم کو کھڑا پایا۔

"یہ صحن میں پڑا تھا میر سائیں! میری نظر پڑی تو اٹھا لایا۔" مکرم نے ایک سبز لفافے کو اس کی طرف بڑھایا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

"سائیں کھانا۔۔۔" وہ رکا۔

"طلب نہیں۔" مرتضیٰ نے منع کردیا تو وہ اسی مودب انداز میں پلٹ گیا۔

"کیا ہے اس میں۔" مرتضیٰ نے بے دلی سے لفافہ چاک کیا تو بیچ میں سے تین، چار کاغذ نکالے۔ اس نے خط نما اس کاغذ پر نگاہیں جمادیں۔

"تمہیں کیا کہہ کر بلاؤں۔۔۔ کوئی رشتہ تو میں نے خود نہیں چھوڑا۔ چلو اس بحث کو رہنے دیتے ہیں۔

مرتضیٰ! جب یہ خط تمہیں ملے گا، میں اور امی یہاں سے جاچکی ہوں گی۔ آج رات ہم نے اسلام آباد جانا ہے اور پھر وہیں سے نقی کے پاس۔

بہت حسد محسوس ہوتا ہے مجھے تم دونوں کو دیکھ کر، کیا کروں یہ میری فطرت ہے، عادت ہے یا جو بھی سمجھ لو۔

وہ پھر آگئی ہے تمہاری زندگی میں۔۔۔ میرے تمام منصوبوں پر پانی پھیر کر، مگر دیکھ لو میرا ایک بھی پلان کامیاب نہیں ہوا۔

میں نے جو چاہا اور جیسے چاہا، سب میری توقع کے خلاف ہوا۔ میں تو اسے خوب بھڑکا کر، تم سے متنفر کرکے، چھوٹی بچی داستانیں سنا کر بھیجا تھا، مگر وہ پھر بھی آگئی۔

کتنی توہین میں نے اشفا کی خود کی تھی۔ اسے یہ تک کہا کہ تم ان چاہی ہو، زبردستی مرتضیٰ کی زندگی میں شامل کی گئیں۔ تمہاری ماں نے مرتضیٰ کے پیر پکڑ کر اسے منایا کہ اس کی بگڑی بیٹی سے شادی کرلو۔ کتنا زہر بھرا تھا میں نے اس کے دل میں اور ذہن میں۔

میں تو مسرور تھی کہ وہ اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گی، مگر وہ پھر بھی آگئی۔

تم دونوں میری آنکھوں کے سامنے رہو، یہ میں برداشت نہیں کرسکتی۔ تم نے مجھے اتنی مرتبہ ٹھکرایا ہے کہ جب اشفا گئی تو میں تمہیں بے عزت کرکے بہت مسرور ہوتی رہی۔ تم میری توہین کرتے رہے اور میں تمہاری متوقع بے عزتی کا سوچ سوچ کر لطف اندوز ہوتی رہی۔

دراصل نفرت مجھے اشفا سے نہیں تم سے ہوگئی تھی، مگر اس نفرت کی لپیٹ میں اشفا بھی آگئی۔ میں مقدر پر شاکی ہونے والی نہیں، اسی لیے طلاق کا لیبل لگوالیا ہے۔ اب یہاں ویسے بھی رکھا کیا ہے، اسی لیے میں اور امی نقی کے پاس جانے کا فیصلہ کرچکی ہیں۔

امی بھی تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ نقی اور تقی نے اپنے حق سے بھی زیادہ زمین وصول کرلی ہے، شاید تمہارے اسی رویے نے امی کے موڈ کو بھی بدل دیا ہے۔

اب کیا لکھوں کچھ بچا ہی نہیں لکھنے کو، بس اتنی التجا ہے کہ تم مجھے معاف کردو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ، جو اکثر تم نہیں بھلا پاتے۔"

مرتضیٰ نے غم و غصے کی اک تیز لہر من میں اٹھتی محسوس کی۔ جن دو ٹکے کے لوگوں کی اس کے نزدیک کوئی حیثیت و اہمیت نہیں تھی۔ اشفا انہی لوگوں کے جال میں پھنس گئی۔ اور یہ مہوش کی باتوں میں آئی کیوں؟ براہ راست مجھ سے اس نے کیوں نہ پوچھا، نہ جانے کون کون سی غلط فہمیاں اس نے دل میں پالی رکھی ہیں۔

مرتضیٰ کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ ساری رات وہ جاگتا رہا اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی صبح فجر کے وقت ثانیہ کی چہکتی آواز سنائی دی تھی۔

"لالا! بیٹی ہوئی ہے اور وہ بھی اتنی پیاری کہ میں بتا



UrduPhoto.com

نہیں سکتی۔"
مرتضیٰ نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا اور اگلا پورا ہفتہ وہ گاؤں ہی میں رہا ادھر اشفا غم سے نڈھال مسلسل رو رہی تھی۔ اسے خود پر بہت غصہ آرہا تھا اور اپنی دس دن کی بیٹی پر بھی۔
"اتنی اہمیت ہے تمہاری' باپ نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔" اسے رہ رہ کر وہ وقت یاد آرہا تھا جب وہ شازم کو گود میں اٹھائے اسپتال سے آئی تھی اور مرتضیٰ اور عاشر نے پورے صحن میں بھنگڑا ڈالا تھا۔ مٹھائیاں تقسیم کی تھیں۔
مرتضیٰ کتنی محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا تھا اور شازم کو پیار کرتا رہا۔ اور اب اس نے آنا بھی گوارا نہیں کیا۔ ثانیہ اسے سمجھا کر تھک چکی تھی۔
"کوئی ضروری کام ہوگا اسی لیے نہیں آسکے۔"
"کام ہم لوگوں سے زیادہ اہم ہیں۔" وہ غصے سے بھنکاری۔ ثانیہ کو اس لمحے بہت پہلے والی روتی دھوتی' جھگڑا کرتی اشفا کی جھلک دکھائی دی تھی۔

☆ ☆ ☆

پندرہ دن بعد مرتضیٰ کی واپسی ہوئی اور وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے کی بجائے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اشفا کو پتا چلا تو وہ غصے سے حواس کھو بیٹھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہیں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر روئے' مگر دوسرے ہی پل وہ امن کو اٹھائے دھاڑ سے دروازہ کھولے مرتضیٰ کے کمرے میں موجود تھی۔
"بہت گناہ گار ہوں میں' بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہے مجھ سے' جس کی کوئی معافی نہیں۔ بہت غلطیاں کی ہیں میں نے' کیا اس کی سزا میری بچی کو ملے گی۔
میں مانتی ہوں' میں غلط تھی اور آپ سب کو بھی غلط سمجھتی رہی' میرے نزدیک سارے پاکستانی جھوٹے اور لالچی تھے' جو گرین کارڈ کے لالچ میں شادی کرتے ہیں۔
جب ماما نے آپ کے ساتھ اچانک میری شادی کا فیصلہ کیا تو مجھے شاک لگا۔ میں مربہ جیسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اسی لیے میں انکار کرتی رہی۔
مجھے دکھ ہوا کہ ماما نے مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر دیا۔ مجھے آپ سب لوگ بھی دھوکے باز اور بے ایمان محسوس ہوئے۔ مجھے یقین تھا کہ آپ بھی میرے ساتھ وہی کچھ کریں گے جو مربہ کے ساتھ یاسر نے کیا۔ مگر مجھے بہت عرصے بعد اپنے خیالات اور منفی سوچوں کو بدلنا پڑا تھا۔
سب سے بڑھ کر مہوش کی بے رنگ زندگی' اور جو آپ نے اس کے ساتھ محبت کا فراڈ کیا اس چیز نے بھی مجھے کافی دکھ پہنچایا۔ مگر میں اس وجہ سے واپس امریکہ نہیں گئی تھی۔ اصل وجہ تو یہ تھی کہ ماما نے مجھے آپ سب کی نظروں میں حقیر کر ڈالا تھا۔
جب کوئی ماں' باپ خود سے اپنی بیٹی کا رشتہ ڈالتے ہیں تو کیا عزت رہ جاتی ہے ان کی بھی اور ان کی بیٹی کی بھی۔ میرے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ میں زبردستی آپ کی زندگی میں شامل کی گئی ہوں۔ ماما نے منت سماجت کر کے آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ آپ مجھے قبول کر لیں۔ مجھ سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوتی۔
اب جبکہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے آپ کی خاطر خود کو بدل لیا۔ کھانا بنانا سیکھا' گھر کے کام سیکھے۔ آپ کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا اور آپ میری ایک غلطی کو نظر انداز نہیں کر سکے۔ میں تھک گئی ہوں مرتضیٰ؟ آپ کے تلخ رویے' کٹھور' سرد رویوں اور آپ کی بے اعتنائیوں کا بوجھ سہہ سہہ کر۔ میں ہار گئی ہوں مرتضیٰ! میں ہار گئی ہوں۔ کیا آپ اپنی بیٹی کی خاطر بھی مجھے معاف نہیں کر سکتے۔"
وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور مرتضیٰ کے ہاتھوں کے طوطے' کبوتر سب اڑ گئے۔ اس کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔
"پلیز اشفا! چپ کر جاؤ۔"
"نہیں کرتی چپ۔" وہ اور زور زور سے رونے لگی تھی۔
"غصہ مجھے کرنا چاہیے تھا' الٹا خفا تم ہو رہی ہو۔"



"آپ کو کیوں غصہ کرنا چاہیے؟" وہ تنک کر بولی۔
"تم اس چیپ مہوش کی گھٹیا باتوں پر یقین کر کے اپنی زندگی کو جہنم بنانے چلی تھیں۔ کیا میں تمہارے نزدیک اتنا ہی ناقابل اعتبار تھا۔ کیا تم میرے ساتھ اپنی بدگمانیوں کو شیئر نہیں کر سکتی تھیں۔ تم نے احمقوں کی طرح میری عزت کو دو کوڑی کیا اور چلتی بنیں' اور بے وقوفوں کی شہزادی تمہیں اسی منحوس نے یہ پٹی پڑھائی ہے کہ عطیہ چاچی اور چاچو نے زبردستی مجھے تم سے شادی کرنے پر مجبور کیا تو یہ سراسر جھوٹ ہے۔ میں اتنا بھی نیک نہیں ہوں کہ سب کی باتوں اور بزرگوں کی جذباتی بلیک میلنگ سے متاثر ہو جاؤں۔ اور ایک بات یہ کہ میرا اور تمہارا رشتہ بچپن سے طے تھا۔"
"کیا؟" اشفا نے حیرت سے کہا۔ مرتضیٰ اس کی گود میں کسمساتی اپنی بیٹی کو اٹھا کر چومنے کے بعد سہولت سے بیڈ پر لٹا کر پھر سے اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔
"تم بہت احمق ہو۔"
"مجھے پتا ہے۔" وہ ناراضی سے بولی۔ مرتضیٰ نے اس کے کمزور زرد چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اس کی پیشانی کو چوما تو وہ قدرے دور ہٹ کر بیٹھ گئی۔
"تمہیں میری بے اعتنائی اور سرد رویہ ناگوار لگتا تھا اور قربت بھی تم سہہ نہیں سکتیں۔" وہ ایک مرتبہ پھر اسے بانہوں کے گھیرے میں لے چکا تھا۔
"مرتضیٰ! کیا کرتے ہیں؟" وہ شرماتے لجاتے دونوں ہاتھوں سے دور ہٹاتے ہوئے بولی تو اس نے اپنے بازوؤں کے حلقے کو مزید تنگ کیا۔ اس پل دروازہ زور سے کھلا اور شازم بھاگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ مرتضیٰ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور اشفا کی ہنسی چھوٹ گئی۔ شازم نے ماں کے بھیگے چہرے کو دیکھ کر باپ کی طرف رخ کیا۔
"مما! آپ کو کس نے ڈانٹا ہے' بابا نے۔"
"ہاں۔" اشفا نے رونی صورت بنا کر کہا۔
"آپ نے شازم کی مما کو کیوں ڈانٹا؟" شازم غصے سے بولا تھا۔ مرتضیٰ نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"میری مجال ہے' جو شازم کی مما کو ڈانٹ سکوں۔"
"پھر مما کیوں روئی ہیں؟"
"مما نہیں گڑیا نے مارا ہے۔" مرتضیٰ نے بیڈ کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل پڑا اور بولا۔ "مما! بہنا کیسے کاٹ میں سے نکل کر یہاں آئی۔ کیا چل کر آئی ہے۔"
"نہیں بیٹا! یہ دوڑ کر آئی ہے۔"
"ہیں مما۔" اس کی تحیر سے آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اشفا نے مرتضیٰ کو گھور کر دیکھا۔ اس پل ثانیہ نے بھی کمرے میں جھانکا تھا۔
"اگر غصے کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ اور روٹھنے منانے کا بھی سین ہو چکا ہے تو باہر تشریف لے آئیں' نمرہ اور عامر آئے ہیں۔"
ثانیہ کے شگفتہ لہجے میں سرشاری تھی جو کہ لالا اور اشفا کو خوش' مسرور دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی۔ ان دونوں کو ایک ساتھ باہر نکلتا دیکھ کر اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی۔
"پروردگار عالم! میرے لالا کے ہرے بھرے گلشن کو سدا آباد رکھنا' اب کسی حاسد کی نظر ان کی خوشیوں پر نہ پڑے۔ نہ کوئی بدگمانی کی فصیل دلوں میں دوری کا سبب بنے' میرے بھائی کے آنگن میں اسی طرح پھول مہکیں' بہاریں سدا یہیں بسیرا رکھیں۔ خوشیوں کی عمر طویل ہو اور غم ہمیشہ کے لیے راستہ بھول جائیں۔"
"بیگم! کہیں تم مجھے تو نہیں بھول گئیں۔ پچھلے بیس دنوں سے یہیں ڈیرہ لگا رکھا ہے۔ بس اب گھر چلنے کی کرو۔" عاشر کی دہائی پر وہ آنسو صاف کرتی سرعت سے باہر نکل گئی تھی۔
کھڑکی میں سے جھانکتا چاند بھی اس پل مسکرا دیا تھا۔

☆ ☆



UrduPhoto.com